رجسٹرڈ ایل نمبر ۴۳۳۰

جلد ۵۴ عدد

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جنوری ۱۹۶۱ء	جلد ۵۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

انگلستان کے مشہور افسانہ نگار سٹیونسن (STEVENSON) نے یوں تو بیشمار کہانیاں ایسی لکھی ہیں جن میں ضمیر کی کشمکش کو نہایت ہی عمدہ طریقے سے واضح کیا گیا ہے مگر اُس کی جس کہانی کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہے وہ مارکھیم (MARKHEIM) ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار مارکھیم ایک شریفانہ زندگی بسر کرنے کا خواہاں ہے لیکن اُسے اتنی دولت ہاتھ نہیں آتی جس سے وہ اپنے اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ چنانچہ وہ اپنے اس نیک مقصد کے حصول کیلیے ایک دکاندار کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس دولت کو حاصل کر لینے کے بعد وہ ایک اچھی زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے گا۔ اُس کے دل میں اس دکاندار کے خلاف کسی قسم کا کوئی بغض و عناد نہیں وہ محض ایک اچھے مقصد کے لیے اس بری حرکت کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے اس فعل پر نادم بھی ہے مگر اسے ناگزیر بھی خیال کرتا ہے۔ اسی اثناء میں جب وہ قتل کر چکا ہے اُس کا اپنا ضمیر ایک انسانی پیکر میں اُس کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور اسے اس بات پر اُکساتا ہے کہ تم اس دکاندار کی ملازمہ کو بھی قتل کر دو تاکہ تمہارا یہ راز افشا نہ ہونے پائے۔ اس پر مارکھیم یہ کہتا ہے کہ میں نے دکاندار کو تو ایک ضرورت کے تحت قتل کیا تھا لیکن میں اب ملازمہ پر ہاتھ کیوں اٹھاؤں۔ اس کا ضمیر پھر اُس کی توجہ اس امر کی طرف دلاتا ہے کہ تمہیں محفوظ و مامون زندگی بسر کرنے کے لیے اس کام کو بھی کرنا ہی ہوگا مارکھیم اس میں تامل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا یہ قتل کا فعل بُرا ہی سہی مگر مجھ میں نیکی اور شرافت کے سارے احساسات ختم تو نہیں ہوئے۔ میں اس بیگناہ پر ہاتھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں

اُس کا ضمیر اُسے اشاروں میں سمجھاتا ہے کہ جس طرح تم نے بے گناہ دکاندار کو ایک اچھے مقصد کی خاطر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اسی طرح یہ کام بھی کر ڈالو اور پھر اطمینان سے زندگی بسر کرو مگر مارکھیم آمادہ نہیں ہوتا ۔ وہ پھر اسے اس کا ماضی یاد دلاتا ہے کہ تم وہ وقت یاد کرو جب تمہیں جھوٹ سے نفرت تھی ، اور پھر تم نے اسے بولنا شروع کیا ، اس کے بعد تم نے چوری شروع کی اور اب قتل جیسے ظالمانہ فعل کا ارتکاب کیا ہے حالانکہ چند سال پہلے قاتلوں کی محض تصاویر دیکھنے سے تمہارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کرتے تھے ۔ یہ ہے تمہارے انحطاط کا راستہ ۔

اس کہانی کے فنی پہلوؤں سے قطع نظر اس میں جس بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ نیک مقاصد کا حصول اُسی صورت ممکن ہے جب ذرائع نیک ہوں ۔ اگر آپ کسی اچھے نصب العین کے لیے جد و جہد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس کے لیے اچھے ذرائع بھی اختیار کریں ۔ اصلاحِ حال کے لیے جو مختلف طریقے کام میں لائے جاتے ہیں وہ بذاتِ خود اصلاح کا نہایت ہی ضروری جزو ہوتے ہیں اور انہیں نظر انداز کر کے اگر مخلصانہ کوشش بھی کی جاتے تو اصلاحِ حال کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا ۔

اہلِ یورپ برسہا برس سے مساوات ، آزادی اور اخوت کی تعلیم دیتے چلے آ رہے ہیں ۔ انہوں نے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں بھی کی ہیں لیکن اس خواب کی عملی تعبیر جب ہمارے سامنے آتی ہے تو وہ سخت گھناؤنی دکھائی دیتی ہے

اس دلکش نعرہ سے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اہلِ یورپ امن و امان کی ایک ایسی دنیا آباد کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام انسان انسانیت کی بنا پر ایک جیسے سلوک کے مستحق ہوں ، وہ ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ اخوت میں بندھے ہوتے ہوں ، آزادی اُن کا پیدائشی

حق ہوا اور اس عز و شرف کو دنیا کی کوئی قوت سلب نہ کر سکے۔ یہ نعرہ کتنا صحیح اور فطرت انسانی کے قریب ہے لیکن سوچیے آخر اس نعرہ کے علمبرداروں کو اس نیک مقصد کے حصول میں ناکامی کیوں ہوئی۔ وہ لوگ جو دنیا کو انسانی مساوات کا درس دینے کے لیے اٹھے تھے انہوں نے گورے اور کالے کی تمیز روا رکھی، وہ جنہوں نے انسانی اخوت کا پرچار کیا تھا انہوں نے اپنی قوم کے ماسوا دوسری اقوام سے اتنا ظالمانہ سلوک کیا کہ اگر اسے درندوں کی طرف بھی منسوب کیا جاتے تو وہ شرم کے مارے اپنی گردنیں جھکا دیں، وہ جنہوں نے آزادی کی دہائی دی تھی۔ انہوں نے مشرقی قوموں کو تاخت و تاراج کیا، نہ صرف اُن کی دولت لوٹی بلکہ اُن کی متاعِ ایمان پر بھی مسلسل یورش کی تاکہ ان کے اندر آزادی حاصل کرنے کی ساری امنگیں ختم ہو جائیں۔

ممکن ہے کہ اس اندوہناک صورتِ حال کو دیکھ کر کوئی شخص یہ کہے کہ اہلِ مغرب اپنے ان دعاوی میں مخلص نہ تھے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن عقل یہ باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ ایک عظیم برِاعظم کی ساری اقوام اس منافقت اور دورنگی کو اپنا قومی شعار بنانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ بات تو کسی حد تک تسلیم ہے کہ ان مختلف اقوام کے عیار اور چالاک لوگ مکر و فریب سے ان قوموں کے اندر قوت و طاقت حاصل کر لیں اور پھر وسائلِ حکومت کو کام میں لا کر افراد کو غلط راہوں پر ڈال دیں لیکن طبیعت اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ اس نوعناک انحطاط کا یہ وسیع کام قوم کی معتد بہ اکثریت کی مرضی کے بغیر کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک اہلِ یورپ کی اس مقدس مشن میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جسے سٹیونسن نے مارٹھیم کی مختصر کہانی میں بیان کیا ہے یعنی اگر مقاصد نیک بھی ہوں لیکن حیث تک اُن کے حصول کے لیے نیک ذرائع اختیار نہ کیے جائیں انسان کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آپ اب اسی نعرہ کو لیجیے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی مساوات، اخوت و آزادی۔ اگر یہ تینوں انسان کے پیدائشی حقوق ہیں جن سے وہ فطری طور پر نوازا گیا ہے تو پھر اس میں عرب و عجم، مغرب و مشرق یا گورے اور کالے کی قطعاً کوئی تمیز نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان کو انسانیت کے ایک فرد کی حیثیت سے پیدائش کے وقت یہ حقوق خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ وطن رنگ و نسل، یا زبان کے کسی امتیاز کی بنا پر کسی انسان کو ان سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

اس نقطۂ نظر کے مطابق انسانیت کی حد تک یہ حقوق ہمہ گیر اور آفاقی ہیں۔ اب جو فرد، گروہ یا قوم دنیا میں اس دعوے کے ساتھ اٹھے کہ جن انسانوں کے یہ حقوق سلب کیے گئے ہیں انہیں اُسے واپس دلوانا ہے اور اس کام کو ہی وہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد خیال کرے اُسے سب سے پہلے اپنے دل سے "من و تو" کی تمیز مٹانا ہو گی اور اپنے آپ کو وقتی فائدوں اور مصلحتوں سے بلند کر کے اس عظیم خدمت کے لیے تیار کرنا ہو گا۔ پھر اس کے لیے وہ اسی نوعیت کی عملی تدابیر اختیار کرے گی جن میں گروہی اور وطنی عصبیت اور نسلی تفوق کا کوئی شائبہ تک نہ ہو۔ اس آفاقی نقطۂ نظر اور خالص اخلاقی اور انسانی طرزِ عمل ہی سے انسانیت کو آزادی، مساوات اور اخوت کے حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک قوم دعویٰ تو ان انسانی حقوق کا کرے لیکن اُس کے فکر و عمل کے پیچھے تنگ نظری، تعصب اور خود غرضی کارفرما ہو تو پھر وہ اس مقدس مقصد میں نیک تمناؤں اور آرزوؤں کے باوجود کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر وائٹ ہیڈ (WHITE HEAD) نے مذہب کی تعریف کرتے ہوئے ایک بڑے کام کی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آفاقی نقطۂ نظر اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان مادی نفع و نقصان سے بلند ہو کر سوچے اور اُس کا اپنے مادی ماحول سے تعلق تو ہو مگر وہ اس کے خم و پیچ میں گرفتار نہ ہونے پائے۔ پروفیسر موصوف نے یہ بات اگرچہ مذہب

کے ضمن میں کہی ہے لیکن اسی میں اُس نے مغربی فکر و عمل کے تضاد کی بھی نہایت اچھے طریق سے نشاندہی کر دی ہے۔ اہلِ مغرب دنیا کو تعلیم تو آزادی، مساوات اور اخوت کی دیتے ہیں، لیکن اس کے طبعی تقاضوں کو پورا کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ پوری نوع انسانی ان نعمتوں سے اسی وقت متمتع ہو سکتی ہے جب ان کی حفاظت و پاسبانی کرنے والے لوگ قومی اور نسلی تعصبات سے پاک ہوں اور وہ صرف انسانیت کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی بنائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقدس مشن اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب اس کے علمبرداروں کا اس کائنات اور اس کی ساری اشیاء کے بارے میں نقطۂ نظر تبدیل ہو جائے۔ اس مشن کو اپنا لینے کے بعد ان کا فرض ہے کہ وہ کامیابی کے معیار اور اشیاء و افعال کے متعلق مادی نقطۂ نظر ترک کر دیں اور انہیں وزن کرنے اور ان کی تقویم کے لیے ایسی میزان اور ایسا مقوم تیار کریں جن سے اس مقصد کو تقویت حاصل ہوتی ہو۔

مگر مغرب میں جو کچھ فی الواقع ہوا ہے وہ اس مقصد کی عین ضد ہے۔ اہلِ مغرب نے مارکھیم کی طرح آفاقی مقاصد کو نسلی اور قومی تعصبات کے ذریعہ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی وہ دنیا میں مساوات کے علمبردار بن کر اٹھے ہیں مگر مادی فوائد و لذائذ کی پرستش نے انہیں اتنا تنگ نظر بنا دیا ہے کہ وہ دنیا کے سارے منافع اپنی ذات کے لیے اور اپنی قوم کے لیے سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔ اسی بنیاد پر انہوں نے خیر و شر کے سارے معیار مرتب کیے ہیں۔ چنانچہ مساوات کی عملی تعبیر اب اُن کے نزدیک یہ قرار پائی ہے کہ خود اُن کی اپنی قوم کے مختلف افراد میں تو مساوات ہو لیکن جو لوگ اُن کے وطن یا اُن کی نسل سے تعلق نہیں رکھتے انہیں غلام بنا کر رکھا جائے۔

اسی طرح آزادی کے معنی بھی اُن کے نزدیک یہی ہیں کہ ان کی اپنی قوم آزاد ہو اور باقی ساری اقوام کو ان کی خدمت اور چاکری کے لیے غلام بنا دیا جائے۔ یہ ایک ایسا فکری اور

و عملی تضاد ہے جس میں مغرب کا ہر انسان اپنے آپ کو گرفتار پاتا ہے۔

فکر و نظر کی اس تبدیلی کے محرکات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تبدیلی کا سب سے بڑا محرک انسان کی دنیا پرستی ہے۔ اہلِ مغرب پر سے جس دن سے مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوئی ہے وہ اسی روز سے اس تضاد کا شکار چلے آ رہے ہیں۔ آزادی، مساوات اور اخوت انسانی فطرت کی پکار ہیں۔ انسانی ضمیر جب بھی بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے ان پیدائشی حقوق کا مطالبہ کرتا ہے۔ انسان ان حقوق کا شعور حاصل کرنے کے بعد اس حقیقت کا بھی کھوج لگانے کے لیے بیتاب ہوتا ہے کہ وہ ان کا سرچشمہ معلوم کرے۔ وہ بارہا یہ سوال کرتا ہے کہ اگر میرے یہ حقوق مستقل اور پیدائشی ہیں تو پھر ان کا سرچشمہ ریاست، حکومت یا انسان سے کوئی ماوراء ذات ہے اور اگر مجھے افراد یا انسانی اداروں نے ان سے نوازا ہے تو پھر میرا یہ کہنا کہ یہ پیدائشی ہیں، سراسر باطل ہے۔ ان حقوق کا مستقل اور انسانوں کے لیے پیدائشی ہونا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ان کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے تو پھر ان کے حصول اور حفاظت اور پاسبانی کے لیے بھی خدا کے پیش کردہ قوانین و ضوابط کی پابندی کرنی چاہیے۔ اہلِ مغرب نے ان خدائی حقوق کے حصول اور حفاظت کے لیے دنیاوی ضابطوں کی پابندی کرنا چاہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے افکار و اعمال میں زبردست اختلال پیدا ہو گیا۔ ایک مغربی مفکر اینڈرو کانوے نے اس فکری انتشار کی بڑے عمدہ طریق سے مندرجہ ذیل الفاظ میں وضاحت کی ہے:۔

> "انسانوں میں آزادی اور مساوات کا تصوّر اُسی وقت صحیح معنوں میں پنپ سکتا ہے جب انہیں خدا کی مخلوق کی حیثیت سے دیکھا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ خدا کی نظر میں وہ سب برابر ہیں۔ اگر خدا کے وجود اور اخلاقی قوانین کی عملداری

کا انکار کر دیا جائے تو پھر غلامی کے خلاف جبّاری اور قہاری کے خلاف، اور ناجائز انتفاع کے خلاف کوئی دلیل بھی صحیح قرار نہیں دی جاسکتی۔ اگر انسان کسی مستقل عز و شرف کا مالک نہیں، اگر اسے ارادہ و اختیار کی کوئی مستقل آزادی حاصل نہیں، اگر اس کے مستقل حقوق اور فرائض نہیں ــ یہ سب چیزیں خارج سے کسی فرد یا گروہ نے اُسے وقتی طور پر عطا کی ہیں تو اس صورت میں اگر وہ چالاک اور عیّار لوگوں کے ہاتھوں میں غلام بن جاتا ہے اور وہ اس کی خدمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔ وہ حقوق جو انسان کو خدا نے دیئے ہیں وہ خود خدا ہی سلب کر سکتا ہے۔ لیکن وہ حقوق جو انسان کو انسان نے یا کسی انسانی ادارے نے دے رکھے ہیں وہ یہ انسان یا ادارے جب چاہیں واپس لینے کے پوری طرح مجاز ہیں۔ جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ کوئی مستقل حقوق انسان کو خدا نے عطا کیے ہیں، اس وقت تک یہ کہنا بے معنی ہے کہ انسان بعض ایسے حقوق رکھتا ہے جنہیں کوئی انسانی ادارہ نظرانداز نہیں کر سکتا۔

کیا انسانی اخوت محض ایک رعایت ہے جو مادہ پرستانہ نظریات کی حامل ریاست (جس کا رہنما اصول وقتی مصلحت ہے) نے انسان کو دے رکھی ہے یا اسے انسانوں نے خدا کے عیال کی حیثیت سے حاصل کیا ہے۔ کس نظریہ میں زیادہ پائیداری اور استواری ہے؟ کیا آزادی کا تصور روح کی آزادی، ارادہ و اختیار کی آزادی سے پیدا ہوتا ہے یا اسے ایک مادہ پرستانہ معاشرہ ایک رعایت کے طور پر لوگوں کو دیتا ہے۔ ایک انسان جو جبریات کا بے بس غلام ہے اُس کے اعمال و افعال پر آزادی کا اطلاق کس طرح کیا

جا سکتا ہے۔

"انسانی عزو شرف کے پیدائشی حق کو تسلیم کیے بغیر اخلاق کے اندر ایک زبردست اختلال رونما ہوتا ہے۔ اگر اس بنیادی حقیقت کو نظرانداز کر کے آگے بڑھا جائے تو ایسی منزل جلد ہی آجاتی ہے جب قومی اور نسلی تفوق کا نظریہ بطور ایک ناگزیر نتیجہ کے ماننا پڑتا ہے"

پروفیسر موصوف نے اس مضمون میں بڑی دیدہ وری سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ آپ جب یہ کہتے ہیں کہ مساوات، اخوت انسانی اور آزادی انسان کے فطری حقوق ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان مستقل حقوق کا سرچشمہ کسی ایسی ذات کو سمجھیں جسے کبھی فنا نہیں اور جو اپنی بقا کے لیے کسی دوسری ہستی کی محتاج نہیں؛ کیونکہ اگر یہ حقوق فانی انسانوں کے عطا کردہ ہیں تو پھر ان کا مستقل اور فطری ہونا محل نظر ہے۔ اور اگر انسان انہیں عطا کرنے کا مجاز ہے تو وہ انہیں سلب کرنے کا بھی پورا پورا حق اور اختیار رکھتا ہے۔ انسان کا یہ وسیع اختیار انکارِ خدا کا بالکل منطقی نتیجہ ہے۔

معاملہ پھر اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ انسانوں کے اس غیر مسئول اقتدار کا اثر زندگی کے سارے شعبوں پر مرتب ہوتا ہے۔ جب انسان کو دنیا کے معاملات میں "مختارِ کل" مان لیا جائے تو پھر اُس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کرے بالکل بے معنی سی چیز نظر آتی ہے ان حالات میں اُس کے فکر و عمل کا محرک ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ مادی منافع حاصل کرے۔ جس راہ پر چلنے کے بعد وہ اس مقصد کو جلد از جلد حاصل کر سکتا ہے وہی اُس کے نزدیک نیکی اور اخلاق ہے اور جس سے اس مقصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو وہ اُس کی نظر میں برائی اور عیب ہے۔ وہ پھر اخلاق کی مستقل اقدار پر ایمان

نہیں رکھتا بلکہ اُس کے خیر و شر کے پیمانے مادی "فلاح و بہبود" کے ساتھ ہر آن بدلتے رہتے ہیں وہ مارکھیم کی طرح اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ دنیا میں اصل نیکی صرف مقصد کا حصول ہے اور اس کے لیے جو ذرائع بھی اختیار کیے جائیں وہ سارے درست اور مبنی بر انصاف ہیں۔ اگر دولت چوری کرنے سے حاصل ہوتی ہو تو اس کا ارتکاب کر لیا جائے اور اگر قتل کرنے اور ڈاکہ ڈالنے سے اس کا حصول ممکن ہو تو پھر ان ظالمانہ افعال کے کرنے میں بھی کوئی تامل نہ کیا جائے۔ اسی مضمون کو پروفیسر صاحب نے ایک دوسرے مقام پر بڑی صراحت سے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ اصول کہ ریاست کی فلاح انتہائی نیکی ہے اور اس کے لیے جو ذرائع بھی اختیار کیے جائیں وہ صحیح اور درست ہیں۔ یہ وہ الجھن ہے جس میں اہلِ جرمنی گرفتار ہیں۔ آخر اُن لوگوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اُن حضرات کو گردن زدنی سمجھیں جنہوں نے نازی قانون کے احترام میں لوگوں پر دستِ ظلم دراز کیا۔ اگر انہیں سزا کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے تو صرف اُسی صورت میں جب یہ مان لیا جائے کہ خدا نے انسانی اعمال کے متعلق کچھ اخلاقی ضابطے بھی مقرر فرمائے ہیں۔ اگر انسان کا اپنا بنایا ہوا قانون اُس کے حقوق کی اصل بنیاد ہے تو پھر ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم نازیوں کے یہودیوں پر ظلم و ستم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اشتراکی حکومتوں میں کوئی انسان کسی مستقل حق کا مالک نہیں۔ اگر انسانوں کے فی الواقع دنیا میں کوئی مستقل حقوق موجود ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انہیں کس ذات نے استقلال بخشا۔ اگر انسان اس کائنات کا خالق نہیں تو اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ انسانوں کو مستقل طور پر عزّ و شرف کے لازوال خزائن عطا کرے اور انہیں دائمی حقوق سے نوازے"

پروفیسر صاحب نے جو زوردار الفاظ نازیوں اور اشتراکیوں کے متعلق استعمال کیے ہیں وہ اگرچہ خود اپنی امجھنوں کے متعلق نہیں کیے لیکن انہوں نے امریکی قوم کے انحطاط کی طرف نہایت واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے اور نہایت کھلے طور پر اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ہماری زندگی کا یہ تضاد کہ ایک طرف ہم انسانوں کے کچھ مستقل حقوق بھی تسلیم کرتے ہیں مگر دوسری طرف ان حقوق کے عطا کرنے والی ذات کے ضابطوں کی پابندی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے — اس نے ہمیں بربادی کی راہ پر ڈال دیا ہے:

"امریکی زندگی کا مطالعہ اس امر کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت روبہ انحطاط ہے۔ امریکی زندگی الحاد کے زیر اثر آرہی ہے اور اس کی روحانی اور مذہبی بنیادیں آہستہ آہستہ منہدم ہوتی جارہی ہیں۔ دنیائے مغرب ایک عجیب و غریب تضاد کا شکار ہے۔ وہ انسانوں کے مستقل اور پائیدار حقوق کو ان کے روحانی سرچشموں سے بھی منقطع کررہی ہے اور پھر اس کے ساتھ اُن کی حفاظت اور پائیداری کا بھی التزام کرنا چاہتی ہے۔"

یہ تضاد جس کی طرف پروفیسر صاحب نے اشارہ کیا ہے اس میں صرف دنیائے مغرب ہی گرفتار نہیں بلکہ دنیائے مشرق بھی اسی مرض میں مبتلا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دنیائے اسلام میں اس تضاد نے ایک افسوسناک انتشار کی صورت اختیار کر رکھی ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اسی انتشار نے مسلم قوم کو انحطاط کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری ترقی اور خوشحالی کی ساری تدابیر ناکام و نامراد رہتی ہیں

ہم دنیا کو اپنے دعووں سے یہ یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلم قوم ایسے مقدس مقاصد کی علمبردار ہے جنہیں مادی فلاح و بہبود کے پیمانوں سے ناپا نہیں جاسکتا۔ وہ اپنے

نصب العین کے لحاظ سے روحانی اقدار اور اخلاقی ضابطوں کی پابند ہے، اسے رنگ و نسل، زبان اور وطن کے امتیازات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دعاوی اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہیں لیکن انہیں محض زوردار الفاظ میں پیش کر دینے سے تو مقصد حل نہیں ہوتا۔ ہمارے یہ دعاوی ہم سے بعض مطالبات کرتے ہیں جن میں سب سے اہم مطالبہ یہ ہے کہ ہم جس اسلام کا ہر وقت ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں اس پر ہمیں خود بھی اعتماد ہو، نہ صرف اعتماد ہو بلکہ اسی کی محبت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو۔ اسلام کو ہم ایک سیاسی سٹنٹ کے طور پر استعمال نہ کریں بلکہ اس کے ساتھ ہم صحیح معنوں میں عقیدت رکھیں، اس کے اصول اور ضابطوں کی پابندی میں اپنی اور پوری نوع بشری کی فلاح سمجھیں اور ہر لمحہ اس بات کے آرزومند رہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کے پیش کردہ سانچوں کے مطابق ڈھالیں۔ اسلام پر ایمان لانے کے یہ بالکل بنیادی اور اساسی تقاضے ہیں۔ اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہم جتنی مخلصانہ کوشش کریں گے وہی ہماری اسلام سے محبت اور عقیدت کا صحیح پیمانہ ہوگا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنا اور پوری مسلم قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم اسلام سے اپنی محبت کے معاملے میں مخلص نہیں ہیں۔ اسلام سے ہمیں وابستگی تو ضرور ہے لیکن یہ وابستگی اتنی ہی ہے جتنی کہ خود اسلام میں تغیر پذیری کی صلاحیت۔ یہ زبان کی حد تک ہماری عقیدت کا مرکز و محور ہے لیکن عملی طور پر یہ ہمارا خادم ہے۔ جیسے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اتنا ہی دخل حاصل ہے جس کی ہم نے اسے اجازت دے رکھی ہے۔ اسے زندگی کا مقصود و مطلوب بنانے کی بجائے اب ہم نے ایک آلہ کار بنا لیا ہے۔ یہ اب ہمارے ہاتھوں میں بے بس غلام ہے۔ ہمارا اصل مقصد اب معاشی فلاح و بہبود ہے اور اگر اس مقصد کے حصول میں اس سے کوئی خدمت لی جا سکتی ہو تو بہتر ورنہ اسے بڑی آسانی کے ساتھ نظر انداز کر کے بلکہ راہ کا سنگ گراں سمجھتے ہوئے راستے سے ہٹایا

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

تفہیم القرآن

الروم

(۳)

پس[۴۲] (اے نبی، اور نبی کے پیرو)، یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس دین[۴۳] کی سمت میں جما دو[۴۴]، قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے[۴۵]، اللہ کی بنائی ہوئی

---

[۴۲] یہ "پس" اس معنی میں ہے کہ جب حقیقت تم پر کھل چکی، اور تم کو معلوم ہو گیا کہ اس کائنات کا اور خود انسان کا خالق و مالک اور حاکم ذی اختیار ایک اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے تو اس کے بعد لامحالہ تمہارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے۔

[۴۳] اِس دین سے مراد وہ خاص دین ہے جسے قرآن پیش کر رہا ہے، جس میں بندگی، عبادت اور طاعت کا مستحق اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جس میں اُلوہیت اور اس کی صفات و اختیارات اور اس کے حقوق میں قطعاً کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ٹھیرایا جاتا جس میں انسان اپنی رضا و رغبت سے اِس بات کی پابندی اختیار کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کی ہدایت اور اس کے قانون کی پیروی میں بسر کرے گا۔

[۴۴] "یک سو ہو کر اپنا رُخ اس طرف جما دو"، یعنی پھر کسی اور طرف کا رُخ نہ کرو۔ زندگی کے لیے اِس راہ کو اختیار کر لینے کے بعد پھر کسی دوسرے راستے کی طرف التفات تک نہ ہونے پائے۔ پھر تمہاری فکر اور سوچ ہو تو مسلمان کی سی، اور تمہاری پسند اور ناپسند ہو تو مسلمان کی سی۔ تمہاری قدریں اور تمہارے معیار ہوں تو وہ جو اسلام تمہیں دیتا ہے، تمہارے اخلاق اور تمہاری سیرت و کردار کا ٹھپّہ ہو تو اس طرح کا جو اسلام چاہتا ہے، اور تمہاری انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات چلیں تو اُسی طریقے پر جو اسلام نے تمہیں بتایا ہے۔

ساخت بدلی نہیں جاسکتی[۵۵]یہی بالکل راست اور درست دین ہے[۴۷]، مگر اکثر لوگ جانتے

[۵۵] یعنی تمام انسان اِس فطرت پر پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کا کوئی خالق اور کوئی رب اور کوئی معبود و مطاعِ حقیقی ایک اللہ کے سوا نہیں ہے۔ اِسی فطرت پر تم کو قائم ہو جانا چاہیے۔ اگر خود مختاری کا رویہ اختیار کرو گے تب بھی فطرت کے خلاف چلو گے اور اگر بندگی غیر کا طوق اپنے گلے میں ڈالو گے تب بھی اپنی فطرت کے خلاف کام کرو گے۔

اس مضمون کو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاء، ھل تحسون فیھا من جدعاء یعنی ہر بچہ جو کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اصل انسانی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو اسے بعد میں عیسائی یا یہودی یا مجوسی وغیرہ بنا ڈالتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہر جانور کے پیٹ سے پورا کا پورا صحیح و سالم جانور برآمد ہوتا ہے، کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لیکر نہیں آتا، بعد میں مشرکین اپنے اوہامِ جاہلیت کی بنا پر اس کے کان کاٹتے ہیں۔

مسند احمد اور نسائی میں ایک اور حدیث ہے کہ ایک جنگ میں مسلمانوں نے دشمنوں کے بچوں تک کو قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا ما بال اقوام جاوزھم القتل الیوم حتی قتلوا الذریۃ "لوگوں کو کیا ہو گیا کہ آج وہ حد سے گزر گئے اور بچوں تک کو قتل کر ڈالا"۔ ایک شخص نے عرض کیا کیا یہ مشرکین کے بچے نہ تھے؟ فرمایا: انما خیارکم ابناء المشرکین، "وہ تمہارے بہترین لوگ مشرکین ہی کی تو اولاد ہیں"۔ پھر فرمایا کل نسمۃ تولد علی الفطرۃ حتی یعرب عنہ لسانھا فابواھا یھودانھا و ینصرانھا "ہر متنفس فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی زبان کھلنے پر آتی ہے تو ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا لیتے ہیں"۔

ایک اور حدیث جو امام احمدؒ نے عیاض بن حمار المجاشعی سے نقل کی ہے اس میں بیان ہوا ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ کے دوران میں فرمایا ان ربی یقول انی خلقت

نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے[۴۸]، اور ڈرو اس سے[۴۹]

عبادی حنفاء کلھم وانھم اتتھم الشیاطین فاضلتھم عن دینھم وحرمت علیھم ما احللت لھم وامرتھم ان یشرکوا بی ما لم انزل بہ سلطانا "میرا رب فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف پیدا کیا تھا، پھر شیاطین نے آکر انہیں ان کے دین سے گمراہ کیا، اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا اسے حرام کیا، اور انہیں حکم دیا کہ میرے ساتھ اُن چیزوں کو شریک ٹھیرائیں جن کے شریک ہونے پر میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے۔"

[۴۶] یعنی خدا نے انسان کو اپنا بندہ بنایا ہے اور اپنی ہی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ساخت کسی کے بدلے نہیں بدل سکتی۔ نہ آدمی بندہ سے غیر بندہ بن سکتا ہے، نہ کسی غیر خدا کو خدا بنا لینے سے وہ حقیقت میں اس کا خدا بن سکتا ہے۔ انسان خواہ اپنے کتنے ہی معبود بنا بیٹھے، لیکن یہ امر واقعہ اپنی جگہ اٹل ہے کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہے۔ انسان اپنی حماقت اور جہالت کی بنا پر جس کو بھی چاہے خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے لے اور جسے بھی چاہے اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ بیٹھے، مگر حقیقتِ نفس الامری یہی ہے کہ نہ الوہیت کی صفات اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل ہیں نہ اس کے اختیارات، اور نہ کسی دوسرے کے پاس یہ طاقت ہے کہ انسان کی قسمت بنا سکے یا بگاڑ سکے۔

ایک دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اللہ کی بنائی ہوئی ساخت میں تبدیلی نہ کی جائے" یعنی اللہ نے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے اس کو بگاڑنا اور مسخ کرنا درست نہیں ہے۔

[۴۷] یعنی فطرتِ سلیمہ پر قائم رہنا ہی سیدھا اور صحیح طریقہ ہے۔

[۴۸] اللہ کی طرف رجوع سے مراد یہ ہے کہ جس نے بھی آزادی و خود مختاری کا رویہ اختیار کر کے اپنے مالکِ حقیقی سے انحراف کیا ہو، یا جس نے بھی بندگیٔ غیر کا طریقہ اختیار کر کے اپنے اصلی و حقیقی رب سے بغاوت کی ہو، وہ اپنی اس روش سے باز آ جائے اور اسی ایک خدا کی بندگی کی طرف پلٹ آئے جس کا بندہ حقیقت میں وہ پیدا ہوا ہے۔

اور نماز قائم کرو۵۰ اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے

۴۹ یعنی تمہارے دل میں اس بات کا خوف ہونا چاہیے کہ اگر اللہ کے پیدائشی بندے ہونے کے باوجود تم نے اس کے مقابلے میں خود مختاری کا رویہ اختیار کیا، یا اس کے بجائے کسی اور کی بندگی کی تو اس نمک حرامی و بے وفائی کی سخت سزا تمہیں بھگتنی ہو گی۔ اس لیے تمہیں ایسی ہر روش سے بچنا چاہیے جو تم کو خدا کے غضب کا مستحق بناتی ہو۔

۵۰ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے غضب کا خوف، دونوں قلب کے افعال ہیں۔ اس قلبی کیفیت کو اپنے ظہور اور اپنے استحکام کے لیے لازماً کسی ایسے جسمانی فعل کی ضرورت ہے جس سے خارج میں بھی ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص واقعی اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی کی طرف پلٹ آیا ہے اور آدمی کے اپنے نفس میں بھی اس رجوع و تقویٰ کی کیفیت کو ایک عملی ممارست کے ذریعہ سے پے در پے نشو و نما نصیب ہوتا چلا جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اُس ذہنی تبدیلی کا حکم دینے کے بعد فوراً ہی اِس جسمانی عمل یعنی اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ آدمی کے ذہن میں جب تک کوئی خیال محض خیال کی حد تک رہتا ہے اس میں استحکام اور پائیداری نہیں ہوتی۔ اُس خیال کے ماند پڑ جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے اور بدل جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اُس کے مطابق کام کرنے لگتا ہے تو وہ خیال اس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے، اور جوں جوں وہ اس پر عمل کرتا جاتا ہے، اس کا استحکام بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس عقیدہ و فکر کا بدل جانا یا ماند پڑ جانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو رجوع الی اللہ اور خوفِ خدا کو مستحکم کرنے کے لیے ہر روز پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنے سے بڑھ کر کوئی عمل کارگر نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرا جو عمل بھی ہو، اُس کی نوبت دیر دیر میں آتی ہے یا متفرق صورتوں میں مختلف مواقع پر آتی ہے۔ لیکن نماز ایک ایسا عمل ہے جو ہر چند گھنٹوں کے بعد ایک ہی متعین صورت میں آدمی کو دائماً کرنا ہوتا ہے، اور اس میں ایمان و اسلام کا وہ پورا سبق، جو قرآن نے اسے پڑھایا ہے، آدمی کو بار بار دُہرانا ہوتا ہے تاکہ وہ اسے بھولنے نہ پائے۔ مزید برآں کفار اور اہلِ ایمان، دونوں پر یہ ظاہر ہونا ضروری ہے کہ انسانی آبادی میں سے کس کس نے بغاوت

اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔[51]
لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اُسے پکارتے ہیں۔[52] پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو

کی روش چھوڑ کر اطاعتِ رب کی روش اختیار کر لی ہے۔ اہلِ ایمان پر اس کا ظہور اس لیے درکار ہے کہ ان کی ایک جماعت اور سوسائٹی بن سکے اور وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں اور ایمان و اسلام سے جب بھی ان کے گروہ کے کسی شخص کا تعلق ڈھیلا پڑنا شروع ہو اسی وقت کوئی کھلی علامت فوراً ہی تمام اہلِ ایمان کو اس کی حالت سے باخبر کر دے۔ کفار پر اس کا ظہور اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر کی سوئی ہوئی فطرت اپنے ہم جنس انسانوں کو خداوندِ حقیقی کی طرف بار بار پلٹتے دیکھ کر جاگ سکے، اور جب تک وہ نہ جاگے ان پر خدا کے فرمانبرداروں کی عملی سرگرمی دیکھ دیکھ کر دہشت طاری ہوتی رہے۔ ان دونوں مقاصد کے لیے بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی سب سے زیادہ موزوں ذریعہ ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا یہ حکم مکۂ معظمہ کے اُس دور میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں کی ایک مٹھی بھر جماعت کفارِ قریش کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہی تھی اور اس کے بعد بھی ۹ برس تک پستی رہی۔ اس وقت دُور دُور بھی کہیں اسلامی حکومت کا نام و نشان نہیں تھا۔ اگر نماز اسلامی حکومت کے بغیر بے معنی ہوتی، جیسا کہ بعض نادان سمجھتے ہیں، یا اقامتِ صلوٰۃ سے مراد نماز قائم کرنا سرے سے ہوتا ہی نہیں بلکہ "نظامِ ربوبیت" چلانا ہوتا، جیسا کہ منکرینِ سنت کا دعویٰ ہے، تو اس حالت میں قرآن مجید کا یہ حکم دینا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ اور یہ حکم آنے کے بعد ۹ سال تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان اس حکم کی تعمیل آخر کس طرح کرتے رہے؟

[51] یہ اشارہ ہے اس چیز کی طرف کہ نوعِ انسانی کا اصل دین یہی دینِ فطرت ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دین مشرکانہ مذاہب سے بتدریج ارتقا کرتا ہوا توحید تک نہیں پہنچا ہے، جیسا کہ قیاس و گمان سے ایک فلسفۂ مذہب گھڑ لینے والے حضرات سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ جتنے مذاہب دنیا میں پائے جاتے ہیں یہ سب کے سب اُس اصلی دین میں بگاڑ آنے سے رونما ہوئے ہیں۔ الخ

یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں[۵۳] تاکہ ہمارے کیے ہوئے احسان کی ناشکری کریں۔ اچھا، مزے کر لو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں[۵۴]؟

جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں، اور جب ان کے اپنے کیے کرتوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس

یہ بگاڑ اس لیے آیا ہے کہ مختلف لوگوں نے فطری حقائق پر اپنی اپنی نو ایجاد باتوں کا اضافہ کر کے اپنے الگ دین بنا ڈالے اور ہر ایک اصل حقیقت کے بجائے اُس اضافہ شدہ چیز کا گرویدہ ہو گیا جس کی بدولت وہ دوسروں سے جدا ہو کر ایک مستقل فرقہ بنا تھا۔ اب جو شخص بھی ہدایت پا سکتا ہے وہ اسی طرح پا سکتا ہے کہ اس اصل حقیقت کی طرف پلٹ جائے جو دینِ حق کی بنیاد تھی، اور بعد کے ان تمام اضافوں سے اور ان کے گرویدہ ہونے والے گروہوں سے دامن جھاڑ کر بالکل الگ ہو جائے۔ ان کے ساتھ ربط کا جو رشتہ بھی وہ لگائے رکھے گا وہی دین میں خلل کا موجب ہو گا۔

۵۲ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں توحید کی شہادت موجود ہے، امیدوں کے سہارے جب بھی ٹوٹنے لگتے ہیں، ان کا دل خود ہی اندر سے پکارنے لگتا ہے کہ اصل فرمانروائی کائنات کے مالک ہی کی ہے اور اسی کی مدد ان کی بگڑی بنا سکتی ہے۔

۵۳ یعنی پھر دوسرے معبودوں کی نذریں اور نیازیں چڑھنی شروع ہو جاتی ہیں اور کہا جانے لگتا ہے کہ یہ مصیبت فلاں حضرت کے طفیل اور فلاں آستانے کے صدقے میں ٹلی ہے۔

۵۴ یعنی آخر کس دلیل سے ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ بلائیں خدا نہیں ٹالتا بلکہ حضرت ٹالا کرتے ہیں؟ کیا عقل اس کی شہادت دیتی ہے؟ یا کوئی کتاب الٰہی ایسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ میں اپنے خدائی کے اختیارات فلاں فلاں حضرتوں کو دے چکا ہوں اور اب وہ

ہونے لگتے ہیں۔[۵۵] کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کا چاہتا ہے)۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔[۵۶] پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر

تم لوگوں کے کام بنایا کریں گے؟

۵۵ؔ اوپر کی آیت میں انسان کی جہالت و حماقت اور اس کی ناشکری و نمک حرامی پر گرفت تھی۔ اس آیت میں اس کے چھچھورپن اور کم ظرفی پر گرفت کی گئی ہے۔ اس نظر دے کو جب دنیا میں کچھ دولت، طاقت، عزت نصیب ہو جاتی ہے۔ اور یہ دیکھتا ہے کہ اس کا کام خوب چل رہا ہے تو اسے یاد نہیں رہتا کہ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میرے ہی کچھ سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو مجھے وہ کچھ میسر ہوا جس سے دوسرے محروم ہیں۔ اس غلط فہمی میں فخر و غرور کا نشہ اس پر ایسا چڑھتا ہے کہ پھر یہ نہ خدا کو خاطر میں لاتا ہے نہ خلق کو۔ لیکن جونہی کہ اقبال نے منہ موڑا اس کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور بدنصیبی کی ایک ہی چوٹ اس پر دل شکستگی کی وہ کیفیت طاری کر دیتی ہے جس میں یہ ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کر گزرتا ہے، حتیٰ کہ خودکشی تک کر جاتا ہے۔

۵۶ؔ یعنی اہل ایمان اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ کفر و شرک کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر پڑتا ہے، اور اس کے برعکس ایمان باللہ کے اخلاقی نتائج کیا ہیں۔ جو شخص سچے دل سے خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اسی کو رزق کے خزانوں کا مالک سمجھتا ہو، وہ کبھی اس کم ظرفی میں مبتلا نہیں ہو سکتا جس میں خدا کو بھولے ہوئے لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ اُسے کشادہ رزق ملے تو پھولے گا نہیں، شکر کرے گا، خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور فیاضی سے پیش آئے گا اور خدا کا مال خدا کی راہ میں صرف کرنے سے ہرگز دریغ نہ کرے گا۔ تنگی کے ساتھ رزق ملے، یا فاقے ہی پڑ جائیں، تب بھی صبر سے کام لیگا، دیانت و امانت اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دے گا، اور آخر وقت تک خدا سے فضل و کرم کی آس لگائے رہے گا۔ یہ اخلاقی بلندی نہ کسی دہریے کو نصیب ہو سکتی ہے نہ مشرک کو۔

کو داس کا حق) - یہ طریقہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں،ٰ ؎

؎ یہ نہیں فرمایا کہ رشتہ دار، مسکین اور مسافر کو خیرات دے۔ ارشاد یہ ہوا ہے کہ یہ اس کا حق ہے جو تجھے دینا چاہیے، اور حق ہی سمجھ کر تو اسے دے۔ اس کو دیتے ہوئے یہ خیال تیرے دل میں نہ آنے پائے کہ یہ کوئی احسان ہے جو تو اس پر کر رہا ہے، اور تو کوئی بڑی ہستی ہے دان کرنے والی، اور وہ کوئی حقیر مخلوق ہے تیرا دیا کھانے والی۔ بلکہ یہ بات اچھی طرح تیرے ذہن نشین رہے کہ مال کے مالک حقیقی نے اگر تجھے زیادہ دیا ہے اور دوسرے بندوں کو کم عطا فرمایا ہے تو یہ فائد مال اُن دوسروں کا حق ہے جو تیری آزمائش کے لیے تیرے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے تاکہ تیرا مالک دیکھے کہ تو ان کا حق پہچانتا اور ان کو پہنچاتا ہے یا نہیں۔

اس ارشاد الٰہی اور اس کی اصلی روح پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن مجید انسان کے لیے اخلاقی و روحانی ارتقاء کا جو راستہ تجویز کرتا ہے اس کے لیے ایک آزاد معاشرہ اور آزاد معیشت (FREE ECONOMY) کی موجودگی ناگزیر ہے۔ یہ ارتقاء کسی ایسے اجتماعی ماحول میں ممکن نہیں ہے جہاں لوگوں کے حقوقِ ملکیت ساقط کر دیئے جائیں، ریاست تمام ذرائع کی مالک ہو جائے اور افراد کے درمیان تقسیم رزق کا پورا کاروبار حکومت کی مشینری سنبھال لے، حتیٰ کہ نہ کوئی فرد اپنے اوپر کسی کا کوئی حق پہچان کر دے سکے، اور نہ کوئی دوسرا فرد کسی سے کچھ لے کر اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ خیر سگالی پرورش کر سکے۔ اس طرح کا خالص کمیونسٹ نظامِ تمدن و معیشت، جسے آج کل ہمارے ملک میں نظامِ ربوبیت کے پرفریب نام سے زبردستی قرآن کے سر منڈھا جا رہا ہے، قرآن کی اپنی اسکیم کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس میں انفرادی اخلاق کے نشوونما اور انفرادی سیرتوں کی تشکیل و ترقی کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اسکیم تو اسی جگہ چل سکتی ہے جہاں افراد کچھ وسائلِ دولت کے مالک ہوں، ان پر آزادانہ تصرف کے اختیارات رکھتے ہوں، اور پھر اپنی رضا و رغبت سے خدا اور اس کے بندوں کے حقوق اخلاص کے ساتھ ادا کریں۔ اسی قسم کے معاشرے میں یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ فرداً فرداً لوگوں میں ایک

اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔[۵۸] جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا،[۵۹] اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے

طرف ہمدردی، رحم و شفقت، ایثار و قربانی اور حق شناسی و ادائے حقوق کے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوں اور دوسری طرف جن لوگوں کے ساتھ بھلائی کی جائے ان کے دلوں میں بھلائی کرنے والوں کے لیے خیر خواہی، احسانمندی، اور جزاء الاحسان بالاحسان کے پاکیزہ جذبات نشو و نما پائیں، یہاں تک کہ وہ مثالی حالت پیدا ہو جائے جس میں بدی کا رکنا اور نیکی کا فروغ پانا کسی قوتِ جابرہ کی مداخلت پر موقوف نہ ہو بلکہ لوگوں کی اپنی پاکیزگیٔ نفس اور ان کے اپنے نیک ارادے اس ذمہ داری کو سنبھال لیں۔

۵۸؎ یہ مطلب نہیں ہے کہ فلاح صرف مسکین اور مسافر اور رشتہ دار کا حق ادا کر دینے سے حاصل ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز حصولِ فلاح کے لیے درکار نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ ان حقوق کو نہیں پہچانتے اور نہیں ادا کرتے وہ فلاح پانے والے نہیں ہیں، بلکہ فلاح پانے والے وہ ہیں جو خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے یہ حقوق پہچانتے اور ادا کرتے ہیں۔

۵۹؎ قرآن مجید میں یہ پہلی آیت ہے جو سود کی مذمت میں نازل ہوئی۔ اس میں صرف اتنی بات فرمائی گئی ہے کہ تم لوگ تو سود یہ سمجھتے ہوئے دیتے ہو کہ جس کو ہم یہ زائد مال دے رہے ہیں اس کی دولت بڑھے گی، لیکن درحقیقت اللہ کے نزدیک سود سے دولت کی افزائش نہیں ہوتی بلکہ زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ آگے چل کر جب مدینہ طیبہ میں سود کی حرمت کا حکم نازل کیا گیا، تو اس پر مزید یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ یمحق اللہ الربوٰا ویربی الصدقٰت "اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے"۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے دو اقوال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں ربوٰ سے مراد وہ سود نہیں ہے جو شرعاً حرام کیا گیا ہے، بلکہ وہ عطیہ یا ہدیہ و تحفہ ہے جو اس نیت سے دیا جائے کہ لینے والا بعد میں اس سے زیادہ واپس کرے گا۔ یا معطی کے لیے کوئی مفید خدمت انجام دے گا، یا اس کا خوشحال ہو جانا معطی کی اپنی ذات کے لیے نافع ہو گا۔ یہ ابنِ عباس، مجاہد، ضحاک، قتادہ، عکرمہ، محمد بن کعب

ارادے سے دیتے ہو، اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔[۶۰]

القرظی اور شعبی کا قول ہے۔ اور غالباً یہ تفسیر ان حضرات نے اس بنا پر فرمائی ہے کہ آیت میں اس فعل کا نتیجہ صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں اس دولت کو کوئی افزائش نصیب نہ ہو گی، حالانکہ اگر معاملہ اس سود کا ہوتا جسے شریعت نے حرام کیا ہے، تو مثبت طور پر فرمایا جاتا کہ اللہ کے ہاں اس پر سخت عذاب دیا جائے گا۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں اس سے مراد وہی معروف ربٰو ہے جسے شریعت نے حرام کیا ہے یہ رائے حضرت حسن بصری اور سُدّی کی ہے اور علامہ آلوسی کا خیال ہے کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کیونکہ عربی زبان میں ربٰو کا لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی تاویل کو مفسر نیسابوری نے بھی اختیار کیا ہے۔

ہمارے خیال میں بھی یہی دوسری تفسیر صحیح ہے، اس لیے کہ معروف معنی کو چھوڑنے کے لیے وہ دلیل کافی نہیں ہے جو اوپر تفسیر اول کے حق میں بیان ہوئی ہے۔ سورۂ روم کا نزول جس زمانے میں ہوا ہے اس وقت قرآن مجید میں سود کی حرمت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ یہ اعلان اس کے کئی برس بعد ہوا ہے۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو بعد میں کسی وقت حرام کرنا ہوتا ہے، اس کے لیے پہلے وہ ذہنوں کو تیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ شراب کے معاملے میں بھی پہلے صرف اتنی بات فرمائی گئی تھی کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ۖ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۖ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ پھر محض نماز کے وقت اس سے منع کیا گیا۔ اس کے بعد اس کی قطعی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ اسی طرح یہاں سود کے متعلق صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں ہے جس سے دولت کی افزائش ہوتی ہو بلکہ حقیقی افزائش زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سود در سود کو منع کیا گیا (آل عمران، رکوع ۱۴)۔ اور سب سے آخر میں بجائے خود سود ہی کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔

۶۰ے اس بڑھوتری کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جتنی خالص نیت اور جتنے گہرے جذبۂ ایثار اور جس قدر شدید طلب رضائے الٰہی کے ساتھ کوئی شخص راہِ خدا میں مال صرف کرے گا اسی قدر اللہ تعالیٰ

اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیا،[۶۵] پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟[۶۶] پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے اُن کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں۔[۶۷] (اے نبیؐ) ان سے کہو کہ زمین میں

اس کا زیادہ سے زیادہ اجر دیگا۔ چنانچہ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک شخص راہِ خدا میں ایک کھجور بھی دے تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر اُحد پہاڑ کے برابر کر دیتا ہے۔

[۶۴] یہاں سے پھر کفار و مشرکین کو سمجھانے کے لیے سلسلۂ کلام توحید و آخرت کے مضمون کی طرف پھر جاتا ہے۔

[۶۵] یعنی زمین میں تمہارے رزق کے لیے جملہ وسائل فراہم کیے اور ایسا انتظام کر دیا کہ رزق کی گردش سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ حصہ پہنچ جاتا ہے۔

[۶۶] یعنی اگر تمہارے بنائے ہوئے معبودوں میں سے کوئی بھی نہ پیدا کرنے والا ہے، نہ رزق دینے والا، نہ موت و زیست اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور نہ مر جانے کے بعد وہ کسی کو زندہ کر دینے پر قادر ہے، تو آخر یہ لوگ ہیں کس مرض کی دوا کہ تم نے انہیں معبود بنا لیا؟

[۶۷] یہ پھر اس جنگ کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت روم و ایران کے درمیان برپا تھی، جس کی آگ نے پورے شرقِ اوسط کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ "لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی" سے مراد وہ فسق و فجور اور ظلم و جور ہے جو شرک یا دہریت کا عقیدہ اختیار کرنے اور آخرت کو نظر انداز کر دینے سے لازماً انسانی اخلاق و کردار میں رونما ہوتا ہے۔ "شاید کہ وہ باز آئیں" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا سے پہلے اس دنیا میں انسانوں کو ان کے تمام اعمال کا نہیں بلکہ بعض اعمال کا بُرا نتیجہ اس لیے دکھاتا ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھیں اور اپنے تخیلات کی غلطی کو محسوس کر کے اُس عقیدۂ صالحہ کی طرف رجوع کریں جو انبیاء علیہم السلام ہمیشہ سے انسان کے سامنے پیش کرتے چلے آرہے ہیں جس کو

چل پھر کر دیکھو پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے، ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔[۶۵] پس (اے نبی)، اپنا رُخ مضبوطی کے ساتھ جما دو اس دینِ راست کی سمت میں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔[۶۶] اس دن لوگ پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے۔[۶۷] اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے وہ اپنے ہی لیے فلاح کا راستہ صاف کر رہے ہیں تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے۔ یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے[۶۸] اور تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے اور اس غرض کے لیے کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں[۶۹] اور تم اس کا فضل تلاش کرو[۷۰] اور اس کے شکر گزار بنو۔ اور ہم نے تم سے

اختیار کرنے کے سوا انسانی اعمال کو صحیح بنیاد پر قائم کرنے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔

۶۵ یعنی روم و ایران کی تباہ کن جنگ آج کوئی نیا حادثہ نہیں ہے۔ پچھلی تاریخ بڑی بڑی قوموں کی تباہی و بربادی کے ریکارڈ سے بھری ہوئی ہے۔ اور ان سب قوموں کو جن خرابیوں نے برباد کیا ان میں سرِ فہرست یہی شرک کی خرابی تھی جس سے باز آنے کے لیے آج تم سے کہا جا رہا ہے۔

۶۶ یعنی جس کو نہ اللہ تعالیٰ خود ٹالے گا اور نہ اس نے کسی کے لیے ایسی کسی تدبیر کی کوئی گنجائش چھوڑی ہے کہ وہ اسے ٹال سکے۔

۶۷ یہ ایک جامع فقرہ ہے جو تمام اُن مضرتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے جو کافر کو اپنے کفر کی بدولت پہنچ سکتی ہیں۔ مضرتوں کی کوئی مفصل فہرست بھی اتنی جامع نہیں ہو سکتی۔

۶۸ یعنی بارانِ رحمت کی خوشخبری دینے کے لیے۔

۶۹ یہ ایک اور قسم کی ہواؤں کا ذکر ہے جو جہاز رانی میں مددگار ہوتی ہیں۔ قدیم زمانہ کی بادبانی کشتیوں اور جہازوں کا سفر زیادہ تر بادِ موافق پر منحصر تھا اور بادِ مخالف ان کے لیے تباہی کا پیش خیمہ ہوتی

پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لیکر آئے[41]، پھر جنہوں نے جرم کیا[42] ان سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنون کی مدد کریں۔

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے[43]، یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر

تھی۔ اس لیے بارش لانے والی ہواؤں کے بعد ان ہواؤں کا ذکر ایک نعمتِ خاص کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

[40] یعنی تجارت کے لیے سفر کرو۔

[41] یعنی ایک قسم کی نشانیاں تو وہ ہیں جو کائناتِ فطرت میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جن سے انسان کو اپنی زندگی میں ہر آن سابقہ پیش آتا ہے، جن میں سے ایک ہواؤں کی گردش کا یہ نظام ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو انبیاء علیہم السلام معجزات کی صورت میں، کلام الٰہی کی صورت میں، اپنی غیر معمولی پاکیزہ سیرت کی شکل میں، اور انسانی معاشرے پر اپنی حیات بخش تاثیرات کی شکل میں لیکر آئے۔ یہ دونوں قسم کی نشانیاں ایک ہی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ جس توحید کی تعلیم انبیاء دے رہے ہیں وہی برحق ہے۔ ان میں سے ہر نشانی دوسری کی مؤید ہے۔ کائنات کی نشانیاں انبیاء کے بیان کی صداقت پر شہادت دیتی ہیں اور انبیاء کی لائی ہوئی نشانیاں اس حقیقت کو کھولتی ہیں جس کی طرف کائنات کی نشانیاں اشارے کر رہی ہیں۔

[42] یعنی جو لوگ ان دونوں نشانیوں کی طرف سے اندھے بن کر توحید سے انکار پر جمے رہے اور خدا سے بغاوت ہی کیے چلے گئے۔

ہے۔ اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں[۷۴] تو وہ کفر کرتے رہ جاتے ہیں[۷۵]۔ (اے نبی) تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے[۷۶] نہ ان بہروں کو سنا سکتے ہو جو

۷۳ یہاں جس انداز سے نبوت اور بارش کا ذکر یکے بعد دیگرے کیا گیا ہے اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ نبی کی آمد بھی انسان کی اخلاقی زندگی کے لیے ویسی ہی رحمت ہے جیسی بارش کی آمد اس کی مادی زندگی کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہے۔ جس طرح آسمانی بارش کے نزول سے مردہ پڑی ہوئی زمین یکایک جی اٹھتی ہے اور اس میں کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، اسی طرح آسمانی وحی کا نزول اخلاق و روحانیت کی ویران پڑی ہوئی دنیا کو جلا اٹھاتا ہے اور اس میں فضائل و محامد کے گلزار لہلہانے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ کفار کی اپنی بدقسمتی ہے کہ خدا کی طرف سے یہ نعمت جب اُن کے ہاں آتی ہے تو وہ اس کا کفران کرتے ہیں اور اس کو اپنے لیے مژدۂ رحمت سمجھنے کے بجائے پیامِ موت سمجھ لیتے ہیں۔

۷۴ یعنی بارانِ رحمت کے بعد جب کھیتیاں سرسبز ہو چکی ہوں اس وقت اگر کوئی ایسی سخت سرد یا سخت گرم ہوا چل پڑے جو ہری بھری فصلوں کو جلا کر رکھ دے۔

۷۵ یعنی پھر وہ خدا کو کوسنے لگتے ہیں اور اس پر الزام رکھنے لگتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی مصیبتیں ہم پر ڈال رکھی ہیں۔ حالانکہ جب خدا نے ان پر نعمت کی بارش کی تھی اس وقت انہوں نے شکر کے بجائے اس کی ناقدری کی تھی۔ یہاں پھر ایک لطیف اشارہ اس مضمون کی طرف ہے کہ جب خدا کے رسول اُس کی طرف سے پیامِ رحمت لاتے ہیں تو لوگ ان کی بات نہیں مانتے اور اس نعمت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے کفر کی پاداش میں خدا ان پر ظالموں اور جباروں کو مسلط کر دیتا ہے اور وہ جور و ستم کی چکی میں انہیں پیستے ہیں اور جوہر آدمیت کا قلع قمع کر ڈالتے ہیں تو وہی لوگ خدا کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں اور اسے الزام دیتے ہیں کہ اس نے یہ کیسی ظلم سے بھری ہوئی دنیا بنا ڈالی ہے

۷۶ یہاں مُردوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ضمیر مر چکے ہیں، جن کے اندر اخلاقی زندگی کی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے، جن کی بندگیٔ نفس اور ضد اور ہٹ دھرمی نے اُس صلاحیت ہی کا خاتمہ کر دیا ہے

پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہوں۸۷، اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہِ راست دکھا
سکتے ہو۸۸۔ تم تو صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ ع۶
اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی، پھر اس ضعف
کے بعد تمہیں قوت بخشی، پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا
ہے پیدا کرتا ہے۸۹۔ اور وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اور جب
وہ ساعت برپا ہوگی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھیرے

جو آدمی کو حق بات سمجھنے اور قبول کرنے کے قابل بناتی ہے۔

۸۷ بہروں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دلوں پر ایسے قفل چڑھا رکھے ہیں کہ سب کچھ سن کر بھی وہ کچھ نہیں سنتے۔ پھر جب ایسے لوگ یہ کوشش بھی کریں کہ دعوتِ حق کی آواز سرے سے ان کے کان میں پڑنے ہی نہ پائے، اور داعی کی شکل دیکھتے ہی دُور بھاگنا شروع کر دیں تو ظاہر ہے کہ کوئی انہیں کیا سنائے۔ اور کیسے سنائے۔

۸۸ یعنی نبی کا کام یہ تو نہیں ہے کہ اندھوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ساری عمر راہِ راست پر چلاتا رہے۔ وہ تو راہِ راست کی طرف رہنمائی ہی کر سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں کی ہیے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہوں اور جنہیں وہ راستہ نظر ہی نہ آتا ہو جو نبی انہیں دکھانے کی کوشش کرتا ہے، ان کی رہنمائی کرنا نبی کے بس کا کام نہیں ہے۔

۸۹ یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا، یہ ساری حالتیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ اسی کی مشیت پر موقوف ہے کہ جسے چاہے کمزور پیدا کرے اور جس کو چاہے طاقت ور بنائے، جسے چاہے بچپن سے جوانی تک نہ پہنچنے دے اور جس کو چاہے جوانا مرگ کر دے، جسے چاہے لمبی عمر دے کر بھی تندرست و توانا رکھے اور جس کو چاہے شاندار جوانی کے بعد بڑھاپے میں اس طرح ایڑیاں رگڑوائے کہ دنیا اسے دیکھ کر عبرت کرنے لگے۔ انسان اپنی جگہ جس گھمنڈ میں چاہے مبتلا ہوتا رہے مگر خدا کے قبضۂ قدرت میں وہ اس طرح بے بس ہے کہ جو حالت بھی خدا اس پر طاری کر دے اسے وہ اپنی کسی تدبیر سے نہیں بدل سکتا۔

ہیں[۸۳]، اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے[۸۴]۔ مگر جو علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روزِ حشر تک پڑے رہے ہو، سو یہ وہی روزِ حشر ہے، لیکن تم جانتے نہ تھے۔ پس وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا[۸۵]۔

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ، جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ اس طرح ٹھپہ لگا دیتا ہے اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو جاہل ہیں۔ پس (اے نبی) صبر کرو، یقیناً اللہ کا وعدہ[۸۶] سچا ہے

---

[۸۲] یعنی قیامت جس کے آنے کی خبر دی جا رہی ہے۔

[۸۳] یعنی مرنے کے وقت سے قیامت کی اس گھڑی تک۔ ان دونوں ساعتوں کے درمیان چاہے دس بیس ہزار برس ہی گزر چکے ہوں، مگر وہ یہ محسوس کریں گے کہ چند گھنٹے پہلے ہم سوئے تھے اور اب اچانک ایک حادثہ نے ہمیں جگا اٹھایا ہے۔

[۸۴] یعنی ایسے ہی غلط اندازے یہ لوگ دنیا میں بھی لگاتے تھے۔ وہاں بھی یہ حقیقت کے ادراک سے محروم تھے، اسی وجہ سے یہ حکم لگایا کرتے تھے کہ کوئی قیامت ویامت نہیں آنی، مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، اور کسی خدا کے سامنے حاضر ہو کر ہمیں حساب نہیں دینا۔

[۸۵] دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے "نہ ان سے یہ چاہا جائے گا کہ اپنے رب کو راضی کرو"۔ اس لیے کہ توبہ اور ایمان اور عملِ صالح کی طرف رجوع کرنے کے سارے مواقع کو وہ کھو چکے ہوں گے اور امتحان کا وقت ختم ہو کر فیصلے کی گھڑی آچکی ہو گی۔

[۸۶] اشارہ ہے اُس وعدے کی طرف جو اوپر آیت نمبر ۴۷ میں گزر چکا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی بینات کا مقابلہ تکذیب، تضحیک اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کیا ہے اللہ نے ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیا ہے (فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا)، اور اللہ پر یہ حق ہے کہ مومنوں کی نصرت فرمائے (وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ)۔

اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے ۵۵ ع ع۶

---

۵۵ یعنی دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور و غوغا سے تم دب جاؤ، یا ان کی بہتان و افترا کی مہم سے تم مرعوب ہو جاؤ، یا ان کی پھبتیوں اور طعنوں اور تضحیک و استہزاء سے تم پست ہمت ہو جاؤ، یا ان کی دھمکیوں اور طاقت کے مظاہروں اور ظلم و ستم سے تم ڈر جاؤ، یا ان کے دیے ہوئے لالچوں سے تم پھسل جاؤ، یا قومی مفاد کے نام پر جو اپیلیں وہ تم سے کر رہے ہیں ان کی بنا پر تم ان کے ساتھ مصالحت کر لینے پر اتر آؤ۔ اس کے بجائے وہ تم کو اپنے مقصد کے شعور میں اتنا ہوشمند، اور اپنے یقین و ایمان میں اتنا پختہ، اور اپنے عزم میں اتنا راسخ اور اپنے کیرکٹر میں اتنا مضبوط پائیں کہ نہ کسی خوف سے تمہیں ڈرایا جا سکے، نہ کسی قیمت پر تمہیں خریدا جا سکے، نہ کسی فریب سے تم کو پھسلایا جا سکے، نہ کوئی خطرہ یا نقصان یا تکلیف تمہیں اپنی راہ سے ہٹا سکے، اور نہ دین کے معاملہ میں کسی لین دین کا سودا تم سے چکایا جا سکے۔ یہ سارا مضمون اللہ تعالیٰ کے کلام بلاغت نظام نے اس ذرا سے فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ "یہ بے یقین لوگ تم کو ہلکا نہ پائیں"۔ اب اس بات کا ثبوت تاریخ کی بے لاگ شہادت دیتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا پر ویسے ہی بھاری ثابت ہوئے جیسا اللہ اپنے آخری نبی کو بھاری بھرکم دیکھنا چاہتا تھا۔ آپ سے جس نے جس میدان میں بھی زور آزمائی کی اس نے اسی میدان میں مات کھائی اور آخر اس شخصیت عظمیٰ نے وہ انقلاب برپا ہی کر کے دکھا دیا جسے روک دینے کے لیے عرب کے کفر و شرک نے اپنی ساری طاقت صرف کر دی اور اپنے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔

ارض القرآن کا سفر

(از جناب محمد عاصم صاحب)

(۷)

عصر کے بعد ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عبداللہ بن کلیب اور ان کے ساتھ ان کے اور ہمارے دوست مقبول عبدالکافی تشریف لائے۔ شیخ عقیل العطاس، مکہ معظمہ میں ہمارے مطوف بھی تشریف لائے، بڑی ہی محبت اور پُرتپاک طریقہ پر ملاقات کی۔ رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے بتایا کہ یہاں میرے ایک دوست شیخ سلیمان الصنیع ہیں جو مقامی مجلس شوریٰ کے رکن بھی ہیں۔ انہیں مکہ معظمہ کے آثار سے گہری واقفیت اور دلچسپی ہے میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔ آثار کے دیکھنے اور سمجھنے میں وہ آپ لوگوں کی بڑی مدد کریں گے۔ پہلے ہی قدم پر یہ خوشخبری سُن کر ہم نے اطمینان اور خوشی کا سانس لیا۔ مغرب کے بعد حرم میں بعض پاکستانی احباب سے ملاقات ہوئی۔

حرم کی نماز حج کے دنوں میں تو حرم میں نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہی ہے، لیکن دوسرے دنوں میں بھی یہ تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ ظہر اور عصر کی نمازوں میں مطاف اور چاروں طرف کے برآمدے نمازیوں سے بھر جاتے ہیں۔ مغرب، عشا اور صبح کی نمازوں میں مطاف اور برآمدوں کے علاوہ صحن (جہاں کنکریاں بچھی ہوئی ہیں) میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ یہ تعداد حج کے دنوں کے مقابلہ میں کتنی ہی کم ہو، لیکن پھر بھی دنیا بھر کی کسی مسجد میں نمازیوں کی اتنی تعداد کبھی نہ ہوتی ہو گی۔ نماز با جماعت کے اوقات کو چھوڑ کر سال بھر میں ایک منٹ بھی ایسا نہیں آتا جب اللہ کے بندے کعبہ کا طواف اور حجر اسود کی تقبیل و استلام نہ کر رہے ہوں۔ سنا ہے چند سال ہوئے مکہ معظمہ میں سخت بارش ہوئی، جس کی وجہ سے مطاف پانی سے بھر گیا، لیکن اس

حال میں بھی اللہ کے بہت سے بندے پانی میں تیر کر طواف کرتے رہے۔ اللہ کے ایک برگزیدہ بندے نے بے آب وگیاہ ریگستان کے اندر اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کیا اور دنیا بھر کے انسانوں کو اس کی طرف پکارا۔ یہ اسی پکار کی بازگشت ہے کہ دنیا بھر کا مسلمان ہر ملک اور ہر خطہ سے ہر موسم میں لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک ... کہتا ہوا اس گھر کی طرف کھنچا چلا آتا ہے، اور جو نہیں آسکتا، وہ اس کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ آج سے چار ہزار سال پہلے سے جاری ہے اور جب تک روئے زمین اسلام کے ماننے والے باقی ہیں، یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری ہی رہے گا۔ یہ آخر اسلام کے دین الٰہی ہونے کی نہایت اہم دلیل نہیں ہے تو کیا ہے؟

مکہ معظمہ کا موسم مکہ معظمہ میں ہمیں جدہ سے بھی زیادہ گرمی محسوس ہوئی۔ نومبر کے آخر اور دسمبر کے شروع کا موسم تھا، لیکن گرمی کا یہ عالم تھا کہ ہم رات کو نہ صرف دروازے کھول کر بلکہ بجلی کا پنکھا لگا کر سوتے تھے۔ گرمی کے علاوہ مچھر بھی بڑی کثرت سے تھے۔ بجلی کا پنکھا اس لیے بھی لگانا پڑتا تھا کہ مچھروں سے بچنے کے لیے چادر کا اوڑھنا ضروری تھا، لیکن چادر اوڑھتے تھے تو سخت گرمی محسوس ہوتی تھی۔ جب تک ہم مکہ معظمہ میں ٹھہرے رہے، ہر رات سونے کے سلسلے میں ہمارا یہی معمول رہا۔ صبح کے وقت ہم بہت سے لوگوں کو کھلی چھتوں پر مچھردانیاں لگا کر سوتے پایا کرتے تھے۔ ان دنوں میں بھی برف کا استعمال وہاں عام ہوتا تھا۔

پاکستانی شفاخانہ اگلے دن ۲ دسمبر، مولانا جاتے قیام پر رہے۔ چودھری غلام محمد صاحب کی طبیعت خراب تھی اس لیے ہم دونوں ہسپتال گئے۔ مکہ معظمہ میں حاجیوں کی طبی امداد کے لیے پاکستان کی طرف سے ایک شفاخانہ قائم ہے، جو سال کے دوسرے دنوں میں بھی کام کرتا رہتا ہے۔ چودھری صاحب نے وہاں سے دوا لی اور ٹیکہ لگوایا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ شفاخانہ بہت خوب کام کر رہا ہے۔

وزارت داخلیہ اس کے بعد میں اور چودھری صاحب وزارت داخلیہ گئے۔ جس کا دفتر

ریاض کے بجائے مکہ معظمہ میں ہے۔ اس کے مدیر سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ امیر مُساعِد کے تار پر ہم نے مدیر الامن العام (غالباً انسپکٹر جنرل پولیس) کو ہدایات بھیج دی ہیں۔ آپ لوگ ان سے ملیں۔ مدیر الامن العام کے پاس آئے، تو انہوں نے بتایا کہ ہم نے تمام مقامات پر آپ لوگوں کو التسہیلات والارشادات اللازمہ (ضروری ہدایات اور آسانیاں) بہم پہنچانے کے لیے تار روانہ کر دیئے ہیں، اس لیے اب آپ لوگ پورے ملک میں جہاں چاہیں، پھر سکتے ہیں، کہیں کوئی دقت پیش آئے تو پولیس والوں سے مدد لیجیے ـــــ یہ سب آسانیاں امیر مُساعِد کے تار کی وجہ سے حاصل ہوئیں، ورنہ محض پاسپورٹ پر ایک اجنبی مسافر کے لیے سوائے ان مقامات کے جن کی تصریح اس کے پاسپورٹ پر کر دی گئی ہو، سعودی مملکت کے اندر گھومنا ممکن نہیں۔ جو لوگ عمرہ کے لیے جاتے ہیں، انہیں صرف مکہ معظمہ، جدہ اور مدینہ منورہ میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہوتی ہے

آثار کی زیارت | عصر کے بعد ہمارا پروگرام مکہ معظمہ کے آثار دیکھنے کے لیے نکلنے کا تھا۔ شیخ عقیل عطاس سے پروگرام پہلے ہی طے ہو چکا تھا، چنانچہ وہ اور ان کے بیٹے امین اپنی موٹر لے کر بروقت ہمارے ہاں آ پہنچے۔ ان کے ساتھ شیخ سلیمان العنیع بھی تھے۔ ان سے طے پایا کہ آغاز جبل ثور، منیٰ اور عرفات سے کیا جائے۔ جبل ثور (وہ پہاڑ جس میں غار ثور واقع ہے) اور دوسرے آثار ان کے بعد دیکھے جائیں۔

دارالارقم | ہم اس سڑک پر چلے جو صفا کے پاس سے شمال کو منیٰ کی طرف جاتی ہے۔ ابھی ہم صفا کے قریب ہی تھے کہ شیخ سلیمان نے سڑک پر ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ دارالارقم کا نصف حصہ نئی تعمیرات کے سلسلے میں اب اس سڑک کے نیچے آگیا ہے اور بقیہ نصف حصہ قریب کی دکانوں میں سے ایک دکان میں شامل کر دیا گیا ہے، گویا اب دارالارقم نامی کوئی عمارت مکہ معظمہ میں موجود نہیں ہے۔

دارالارقم کو دعوت اسلامی کی پوری تاریخ میں جو اہمیت اور اولیت حاصل ہے، وہ کسی

بھی دوسری جگہ کو حاصل نہیں ہے یہی وہ جگہ تھی جہاں ہجرت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کفار مکہ کے شر سے بچنے کے لیے چھپ کر جمع ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو صبر و استقلال کی تلقین فرماتے اور اگر قرآن پاک کی کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو انہیں پڑھ کر سناتے۔ یہی وہ گھر ہے جس کا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ میں ذکر آتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام یہاں جمع تھے کہ حضرت عمرؓ (جب کہ وہ اسلام نہ لاتے تھے) کو اس کی اطلاع ملی اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بزعم خود قتل کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکلے۔ راستے میں انہیں اپنی بہن اور بہنوئی کے مسلمان ہو جانے کی خبر ہوئی، چنانچہ وہ ان کی طرف پلٹ گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے خود ان کا دل اسلام کے لیے کھول دیا۔ سیدھے دارالارقم آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گئے۔ یہ گھر جس کی تاریخ اسلام میں یہ حیثیت اور اہمیت ہو، اس کا سرے سے نام و نشان مٹ جانا ہمارے لیے انتہائی روحانی اذیت کا باعث ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیا کوئی بھی ایسی سکیم نہیں بن سکتی تھی کہ یہ گھر اپنی جگہ قائم رہتا اور سڑکوں اور دکانوں کو کسی اور طریق سے تعمیر کر لیا جاتا؟

مکہ معظمہ میں جتنے دوسرے آثار — گھر اور مساجد — ہیں، ان کی نسبت تاریخی لحاظ سے بہر حال یقینی نہیں ہے، لیکن دارالارقم کی نسبت تاریخی لحاظ سے تقریباً یقینی اور قطعی تھی۔ یہ جس جگہ پر آج سے چند سال پہلے تک قائم تھا، تمام مسلمان بادشاہوں اور امراء نے اس کی اس لحاظ سے ہمیشہ حفاظت کی کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں دارالارقم قائم تھا۔ ہر دور میں اس جگہ قرآن و حدیث کی تعلیم کا کوئی نہ کوئی سلسلہ جاری رہا۔ عمارتیں اگرچہ گرتی اور پھر سے بنتی رہی ہوں گی، لیکن بہر حال جگہ وہی رہی۔ آخری عمارت جسے ۱۹۵۹ء میں ہم نے خود دیکھا ہے، غالباً نویں صدی ہجری کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے دروازے پر بھی دارالارقم لکھا ہوا تھا اور اس کے اندر بھی دو بڑے پتھر رکھے ہوتے تھے، جن میں سے ایک پر یہ عبارت کندہ تھی:

" بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ فی بیوت اذن اللہ ان ترفع ویذکر فیہا اسمہ، یسبح لہ فیہا بالغدو والآصال، ھذا مختبأ رسول اللہ و دارالخیزران و فیھا مبدأ الاسلام "

دوسرے پتھر پر عمارت کے بانی کی حیثیت سے " ابوجعفر محمد بن علی بن ابی منصور الاصفہانی وزیرالشام والموصل" کا نام کندہ تھا۔ ہمارے پہلے سفر کے زمانہ میں شیخ ابوالسمح عبدالظاہر مرحوم کا درس قرآن و حدیث وہاں ہوا کرتا تھا۔ مگر اب ہم وہاں کیا دیکھتے ہیں؟ افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تاریخی آثار سے سعودی حکومت کا تغافل ایک ایسی چیز ہے جو عرب کی سیاحت کرنے والے کو بری طرح کھٹکتی ہے۔ مشرکانہ افعال کو روکنا بالکل برحق۔ مگر اسلام کے نہایت قیمتی آثار تاریخ کو ضائع کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

جبل ابوقبیس آگے بڑھے، تو ... سڑک کے ساتھ ہی ایک پہاڑی سلسلہ ملا، جو حرم سے بھی حجر اسود کے رخ سے نظر آتا ہے۔ اسے جبل ابی قبیس کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنو ہاشم اسی طرف آباد تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انشقاق قمر کا معجزہ بھی اسی پہاڑ پر واقع ہوا تھا، اگرچہ یہ بات قطعی نہیں ہے۔

آگے بڑھتے تو سڑک کی دائیں طرف زرد رنگ کی ایک خوبصورت عمارت میں ترکیوں کا مدرسہ آیا۔ اس کے متعلق بتایا گیا کہ یہ عمارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش پر واقع ہے۔ اس سے کچھ پہلے سڑک کی دائیں طرف ہی چند گلیاں اور ان میں لوگوں کے مکانات اور دکانیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ شعب ابی طالب اسی جگہ تھی۔ اب پہاڑوں کو صاف کر دیا گیا ہے اور لوگوں نے صاف زمین پر دکانیں اور مکانات تعمیر کر لیے ہیں۔ ان ہی میں ایک جگہ کو حضرت علیؓ کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے۔ شعب ابی طالب جبل ابی قبیس سے ملی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان ایک گھاٹی تھی، جہاں ہجرت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ بنو ہاشم تین سال تک محصور رہے اور کفار مکہ

نے حضور کے پورے قبیلے کا معاشی و معاشرتی مقاطعہ کیے رکھا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش کے سامنے سڑک سے دوسری طرف حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابو سفیانؓ کے مکانات کی جگہ بتائی جاتی ہے۔

مسجد الرّایہ اور مسجد الجن کچھ اور آگے بڑھے تو سڑک کی بائیں طرف ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ اس کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ مسجد الرائیہ ہے۔ مسجد الرّایہ اسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اس جگہ واقع ہے جہاں فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر پایہ (جھنڈا) نصب فرمایا تھا۔ اس سے کچھ ہی آگے ایک اور مسجد ہے جسے مسجد الجن کہا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ مسجد اس جگہ واقع ہے جہاں جنوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا تھا اور پھر وہ ایمان لائے تھے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا

آپ کہہ دیجیے کہ میری طرف یہ وحی ہوئی کہ چند جنوں نے مجھے (قرآن پڑھتے) سنا، تو انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک حیرت انگیز کلام سنا ہے جو بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے۔ چنانچہ ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے

المعلیٰ کا قبرستان کچھ اور آگے بڑھے تو بائیں ہاتھ کو مکہ معظمہ کا قبرستان جسے المعلیٰ یا المعلاۃ کہا جاتا ہے آگیا۔ المعلیٰ جاہلیت کے زمانہ سے آج تک اہلِ مکہ کا قبرستان ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب، چچا ابو طالب، اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہؓ اور دوسرے تمام اعزہ یہیں دفن ہوئے ہوں گے اور بہت سے صحابہ کرام اور بعد کے صلحاء و فقہاء و محدثین کی قبریں بھی یہیں ہوں گی، لیکن ان کی جگہوں کا تعین قطعی ناممکن ہے۔ نجدیوں کی حجاز میں آمد سے پہلے یہاں بہت سی پختہ قبروں پر بڑے شاندار قبے بنے ہوئے تھے جو بڑے بڑے صحابہ کی طرف منسوب کیے جاتے تھے اور لوگ ان پر طرح طرح کے نذرانے پیش کرتے تھے۔ نجدیوں نے آکر ان تمام قبوں کو گرا دیا اور پختہ قبروں کو مسمار کر دیا۔ اب یہاں کوئی پختہ قبر نہیں ہے۔ اب بھی بعض قبروں کو بعض صحابہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لیکن اس نسبت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس قبرستان میں ایک جگہ پر حضرت خدیجہؓ، حضورؐ کے دادا عبد المطلب، چچا ابو طالب اور والدہ آمنہ کی قبروں کی نشاندہی کی جاتی تھی لیکن سعودی حکومت نے ان قبروں کو بھی مسمار کر کے ان کے آگے پختہ دیوار بنا دی ہے تاکہ کوئی شخص اس دیوار سے آگے نہ بڑھ سکے

طریق کدا معلیٰ کا قبرستان شمال اور جنوب دونوں طرف سے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے

ان پہاڑیوں کے درمیان سے شمال مغرب کو ایک راستہ جاتا ہے، جسے کُدا کہا جاتا ہے اور یہ وہی راستہ ہے جس سے فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے۔

جبلِ نُور: آگے بڑھ کر منیٰ جانے کے لیے یہ سڑک دائیں طرف — جنوب مشرق — مڑ جاتی ہے۔ موڑ سے تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں جبلِ نُور دکھائی دیا۔ ہم کچھ دیر سڑک پر چلتے رہے۔ پھر نیچے اتر گئے۔ ایک آدھ منٹ اور چلے ہوں گے کہ پہاڑ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ جبلِ نُور اس پہاڑ کا نیا نام ہے، ورنہ اس کا قدیم نام جبلِ حرا ہی مشہور ہے۔ اسی کے اندر وہ غار واقع ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ حرم سے اس کا فاصلہ ڈھائی یا تین میل ہوگا۔ مولانا کا اندازہ ہے کہ یہ دو ہزار فٹ کے قریب اونچا ہے۔ غارِ حرا تک پہنچنے کے لیے دو مرتبہ پہاڑ پر چڑھنا اور اترنا پڑتا ہے اور اس میں — لوگوں کے بتانے کے مطابق — کم از کم دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ ہم اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے مگر وقت بہت تنگ تھا، اس لیے اسے کسی اور دن کے لیے ملتوی کر دیا، مگر افسوس کہ بعد میں بھی اس کا موقع نہ مل سکا اور دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

جبل نور کے دامن میں سعودی حکومت نے حال ہی میں ایک بند تعمیر کرایا ہے، جس سے پہاڑوں پر بارش کا پانی نعیم ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے، ورنہ جب تک یہ بند تعمیر نہ ہوا تھا، آئے سال پانی حرم کے اندر پہنچ جاتا تھا اور بڑی مشکل پیش آتی تھی۔

منیٰ سے عرفات تک: اس کے بعد ہم آگے بڑھے اور منیٰ پہنچ گئے۔ عمارتیں اپنی جگہ قائم تھیں لیکن ان میں کوئی آبادی نظر نہ آرہی تھی۔ یہ بھی خوب شہر ہے۔ سال بھر میں صرف تین دن آباد ہوتا ہے اور یک لخت اس کی آبادی آٹھ دس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ ان تین چار دنوں کے اندر مکانوں کے مالکان حاجیوں سے اتنا کرایہ وصول کر لیتے ہیں جو بڑے شہروں میں اتنی جگہ کے لیے سال بھر میں بھی وصول نہیں ہوتا۔

منیٰ کے وسط میں مسجد الخیف ہے اور یہ اس جگہ واقع ہے جہاں حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا اور صحابہ کرام کے ساتھ پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ جمرۂ اولیٰ و ثانیہ کے درمیان ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے جسے مسجد المنحر کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں

کر حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی کے اونٹ یہاں ذبح فرمائے تھے، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جمرۂ عقبہ (جمرۂ کبریٰ) سے کچھ پہلے ایک چھوٹی سی اور مسجد ہے جسے مسجد العشرہ کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے سال مدینہ کے جن دس آدمیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ یہاں جمع ہوئے تھے۔ جمرہ کے ساتھ ہی ایک اونچی سی جگہ تھی، جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں دوسرے سال مدینہ منورہ کے ۷۲ آدمیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، جو تاریخ کی کتابوں میں بیعت عقبہ کے نام سے مشہور ہے اور اسی لیے اس جمرہ کا نام بھی جمرۂ عقبہ رکھا گیا ہے۔ مگر یہ جگہ بھی اب نئی سڑک کے نیچے آگئی ہے، حالانکہ بیعتِ عقبہ جیسے اہم واقعہ کی تاریخی یادگار کو ذراسی توجہ سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔

منیٰ کے بعد ہم وادیٔ مُحَسِّر ہوتے ہوتے مزدلفہ آئے۔ وادیٔ مُحَسِّر وہ وادی ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے پرندوں نے اللہ کے حکم سے کنکریاں برسا کر ابرہہ اور اس کے لشکر (اصحاب الفیل) کو ختم کیا تھا۔ یہ معذّب وادی ہے۔ اس لیے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا تھا کہ اسے جلد از جلد پار کر جائیں۔ اس کے دونوں طرف پہاڑیوں کا سلسلہ کچھ اس قسم کا ہے اور اس طرح مسلسل چلا جا رہا ہے کہ اس سے گزرتے ہوتے واقعی خوف آتا ہے۔

مزدلفہ وہ جگہ ہے جہاں عرفات سے پلٹتے ہوتے حاجی ایک رات بسر کرتے ہیں اور رمی جمار کے لیے کنکریاں جمع کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کا نام المشعر الحرام مذکور ہے۔ المشعر الحرام اب صرف اس مسجد کا نام ہے، جو اس کے اندر بنی ہوئی ہے۔ یہاں اس مسجد کے سوا کوئی دوسری عمارت نہیں ہے۔

مزدلفہ کے بعد حرم کے حدود ختم ہو جاتے ہیں اور جہاں یہ حدود ختم ہوتے ہیں وہاں نشانات لگے ہوئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حج میں اور لوگ تو عرفات تک جاتے

تھے، لیکن قریش مزدلفہ سے آگے نہ بڑھا کرتے تھے، کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہم اہلِ حرم ہیں، اس لیے حرم کے حدود سے باہر نہ نکلیں گے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر ارشادِ خداوندی " ثم افیضوا من حیث افاض الناس " کے تحت عام لوگوں کے ساتھ خود بھی عرفات تک گئے۔

مزدلفہ سے عرفات جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ دائیں ہاتھ کو ہے، جسے طریق ضب کہا جاتا ہے۔ اسی راستہ سے حاجی مزدلفہ سے عرفات جاتے ہیں۔ دوسرا راستہ بائیں ہاتھ کو ہے، جسے طریق المأزمین کہا جاتا ہے۔ اس راستے سے حاجی عرفات سے مزدلفہ واپس آتے ہیں

عرفات میں مسجد النمرہ کے علاوہ صرف ایک عمارت نظر آئی، جو حج کے موقع پر انتظامیہ عملہ کے دفتر کا کام دیتی ہے۔ یہاں عمارتوں کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہاں حاجی صرف چند گھنٹے ٹھہرتے ہیں اور اس کے لیے خیمے کافی ہوتے ہیں۔ آج سے چند سال پہلے تک عرفات میں صرف دو سڑکیں تھیں، اس لیے حاجیوں کو مغرب کے بعد مزدلفہ واپس جانے میں بڑی دقت پیش آتی تھی، لیکن اب یہاں پانچ سڑکیں بنا دی گئی ہیں، جن سے بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ ۱۹۵۶ء تک غالباً یہاں دو ہی سڑکیں تھیں، اس لیے بس نے ہمیں مغرب کے وقت عرفات سے چل کر رات کے ۱۲ یا ۱ بجے مزدلفہ پہنچایا تھا۔ اب یہاں جا بجا پانی کے نلکے بھی لگا دیے گئے ہیں۔ تاکہ حاجیوں کو پانی کے سلسلے میں بھی کوئی پریشانی نہ ہو۔

عرفات کے ساتھ ہی شمال کی طرف مسجد نمرہ کے عین سامنے وادی عرنہ ہے جس میں حج کے موقع پر وقوف منع ہے۔

عرفات پہنچ کر ہم جبل الرحمہ پر چڑھے جس کا قدیم نام جبل الالال تھا۔ اب اسے جبل الرحمہ کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کے دامن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو وعظ فرمایا تھا۔ اس کے دامن میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف اس جگہ تھا۔ اس کے اوپر بھی ایک مسجد بنی ہوئی ہے اور اس کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وقوف یہاں تھا۔ ہم نے مغرب کی نماز پہاڑی کے اوپر والی مسجد میں

پڑھی۔ پھر نیچے اتر آئے۔ یہاں بہت سے قہوہ خانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ حج کے علاوہ دوسرے دنوں میں مکہ کے بہت سے لوگ سیر و تفریح کے لیے شام کو ادھر آ جاتے ہیں، اس لیے یہ قہوہ خانے سال بھر آباد رہتے ہیں۔ ہم بھی ایک جگہ بیٹھے، چائے پی اور کچھ دیر آرام کر کے شارع المنصور کے راستے مکہ معظمہ واپس آ گئے۔ شارع المنصور ایک نئی سڑک ہے جو براہ راست مکہ معظمہ سے عرفات کو جاتی ہے۔ اس سے وقوف عرفہ کے روز سامان لانے لے جانے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔

استاذ احمد محمد جمال | اگلے روز (۲۰ دسمبر) علی الصباح استاذ احمد محمد جمال ہمارے ہاں تشریف لائے اور کافی دیر تک بیٹھے پاکستان کے حالات سنتے اور اپنے ہاں کے حالات سناتے رہے۔

استاذ احمد محمد جمال سے وہ تمام لوگ ضرور واقف ہوں گے، جنہوں نے اسلامک کلوکیم (۵۷-۱۹۵۸ء) میں ہمارے ہاں کے بعض متجددین کے خلاف ان کی تقاریر سنی ہیں۔ یہ اور ان کے بڑے بھائی صالح محمد جمال مکہ معظمہ کے ایک روزانہ اخبار "الندوہ" کے اڈیٹر ہیں۔ "مکتبۃ الثقافۃ" کے نام سے ان کا ایک مکتبہ بھی ہے جو مکہ معظمہ کا سب سے بڑا مکتبہ ہے۔ یہ دونوں بھائی حسن البنا شہیدؒ کی دعوت سے متاثر ہیں، اسی لیے بڑے سلجھے ہوئے خیالات رکھتے ہیں۔ صالح محمد جمال کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ صحافیوں کے ایک وفد میں ظہران گئے ہوئے ہیں، اس لیے ہماری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اسی روز عصر کے بعد نسیم حجازی صاحب اور ان کے ساتھ راولپنڈی کے وکیل قاضی نذیر احمد صاحب عمرہ کے لیے مکہ معظمہ پہنچے اور ان سے مختصر ملاقات رہی۔

پھر عشاء کے بعد ہم بازدید کے لیے شیخ عبدالمہیمن کے ہاں گئے۔

اگلے دن (۲۱ دسمبر) ہم عبداللہ بن کلیب کے ہاں صبح کے ناشتہ پر گئے۔ ان کی رہائش حرم سے کافی دور محلہ جرول میں ہے۔ وہاں ہماری ملاقات ان کے ایک دوست زکریا صاحب سے بھی ہوئی۔ یہ انڈونیشیا کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم کی غرض سے کئی سال مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں بھی رہ چکے ہیں، اس لیے اردو اچھی جانتے ہیں۔ ہم سے اردو ہی میں بات چیت

کرتے رہے۔ مولانا کی اکثر کتابوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان میں سے بعض کا انڈونیشی زبان میں ترجمہ بھی کر چکے تھے۔

مزید آثار کی زیارت | ۱½ بجے کے قریب ہم پھر آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ اب کی مرتبہ ہمارے ساتھ مکہ معظمہ کے ایک تاجر عطر محمد عالم صاحب اور عبداللہ بن کلیب تھے۔ محمد عالم صاحب کی پیدائش ہندوستان ہی میں کسی جگہ کی ہے، لیکن یہ بچپن ہی میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ اب وہاں ان کا عطر کا کاروبار ہے اور ماشاء اللہ وہ اس میں بڑے کامیاب ہیں۔ ان سے ہماری پہلی ملاقات گذشتہ سفر (۱۹۵۶ء) کے دوران عمان میں ہوئی، جب ہم عمان سے دمشق جانے کے لیے موٹر میں سوار ہو رہے تھے، تو یہ بھی بیت المقدس کی زیارت کے بعد دمشق آرہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی موٹر میں سوار ہو گئے۔ اس سے پہلے مولانا سے واقف تھے، لیکن ملاقات نہ ہوئی تھی۔ پھر حج کے موقع پر بھی ملاقات رہی۔ اب کی مرتبہ انہوں نے آثار دکھانے کی خود ہی پیش کش کی جسے ہم نے قبول کر لیا۔

مسجد محصّب و مسجد الکبش | ہم پہلے منیٰ گئے۔ وہاں مسجد محصّب، مسجد الکبش اور بعض دوسری مساجد باہر ہی سے دیکھیں۔ مسجد محصّب منیٰ کے راستے میں ہے اور لوگوں کے کہنے کے مطابق اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں حجۃ الوداع سے واپس ہوتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ مسجد الکبش منیٰ کے اندر ہے اور یہ اس جگہ بنی ہوئی ہے جہاں کے متعلق لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم نے اس جگہ مینڈھا ذبح کیا تھا۔ یہ سب مسجدیں ترکی عہد کی بنی ہوئی ہیں۔ نجدی حضرات کے برعکس ترک اور اشراف مکہ بہت خوش عقیدہ واقع ہوئے تھے، اس لیے ہر ایسی جگہ کوئی نہ کوئی مسجد بنا ڈالتے تھے، جس کے متعلق انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہاں فلاں واقعہ پیش آیا ہو گا۔ اس لیے جن علماء نے مکہ معظمہ کے آثار کی تحقیق کی ہے وہ گھروں اور مسجدوں میں دار الارقم کی نسبت کو تو بڑی حد تک صحیح مانتے ہیں، لیکن دوسرے آثار کی نسبت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ محمد عالم صاحب بہت سی چٹانوں کے درمیان سے گزارتے ہوئے

ہمیں ایک اور جگہ بھی لے گئے، جس کے متعلق بھی یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مینڈھا یہاں ذبح کیا تھا۔

جبلِ ثَور اس کے بعد ہم جبلِ ثور ـــ وہ پہاڑ جس میں غار ثور واقع ہے ـــ دیکھنے کے لیے شارع المنصور کی طرف روانہ ہوئے جب سڑک کے نشانات کے مطابق مکہ معظمہ ۹ میل رہ گیا تو جبلِ ثور ہمارے بالکل سامنے تھا، اگرچہ اس کا فاصلہ سڑک سے آدھ میل ہو گا۔ جبل نور کی نسبت اس کی اونچائی زیادہ ہے اور اس پر چڑھنے کا راستہ بھی بہت خطرناک ہے۔ غار ثور اس کے عین اوپر ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس پر چڑھنے کی ہمت کرتے ہیں، اور جو لوگ چڑھتے ہیں وہ پانی اور کھانا ساتھ لیکر علی الصباح چڑھنا شروع کرتے ہیں اور دوپہر تک اوپر غار تک پہنچتے ہیں۔ شاید ہم اس پر چڑھنے کی ہمت کر جاتے۔ لیکن وقت بہت زیادہ ہو گیا تھا اور دھوپ تیز ہو گئی تھی اور پھر ہمارے پاس کھانے پینے کا بھی کوئی سامان نہ تھا۔ ہم نے موٹر کو سڑک سے نیچے اتار کر اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کی، مگر ایک جگہ ریت میں ہماری موٹر بھی پھنس گئی۔ بڑی مشکل سے اسے باہر نکالا اور سڑک پر واپس پہنچ گئے۔

غارِ ثور وہ جگہ ہے جہاں ہجرت کے موقع پر کفارِ مکّہ سے چھپنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پناہ لی تھی، اور جس کا قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر ہُوا ہے:

... اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا	... جب کافروں نے اس کو (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو) نکال دیا۔ وہ دو میں سے دوسرا تھا (ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ) جب کہ وہ دونوں غار میں تھے، اور وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ غار مکہ معظمہ کے جنوب میں واقع ہے۔ قدیم زمانہ میں مکہ سے یمن کو جو راستہ جاتا تھا وہ اس کے قریب سے گزرتا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ تو مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے اور مدینہ منورہ مکہ کے شمال میں ہے، اس لیے وہ جنوب کی طرف کیسے آتے اور پھر خاص طور پر اسی غار کا انتخاب انہوں نے کیونکر کیا، جب کہ پہاڑ کی اس قدر بلندی پر اس کا پتہ لگانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر ارد گرد کے بہت سے پہاڑ ایسے ہیں جو اپنی شکل و صورت اور اونچائی میں اس پہاڑ سے مشابہ ہیں۔ ممکن ہے یہ انتخاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ کیا ہو یا یہ کہ آپ کو یا حضرت ابوبکر صدیق کو مکہ معظمہ کے ارد گرد پہاڑوں سے اتنی واقفیت ہو کہ آپ اس غار کو پہلے سے جانتے ہوں۔ بہر حال چھپنے کے لیے اس غار کے انتخاب میں مصلحت یہ تھی کہ کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے راستہ میں تلاش کرتے رہے، حالانکہ حضورؐ اس کے برعکس سمت میں یمن کے راستہ پر ایک ایسے غار میں چھپے ہوئے تھے جس کی طرف ان کا گمان بھی نہ جا سکتا تھا۔

شیخ عقیل عطاس کی دعوت اسی روز ظہر کے بعد شیخ عقیل عطاس کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی، اس کے لیے انہوں نے بڑا ہی اہتمام کیا۔ ہمارے علاوہ اس میں شیخ محمد نصیف، استاذ سعید العمودی (ایڈیٹر ماہنامہ الحج)، استاذ احمد محمد جمال، استاذ عبدالقدوس انصاری (ایڈیٹر ماہنامہ المنہل)، استاذ احمد السباعی (ایڈیٹر ہفتہ وار قریش)، شیخ عبدالرحمٰن مظہر (ہندو پاکستان کے لیے مطوفین کے صدر) اور استاذ احمد الغزاوی (شاہ سعود کے خاص شاعر اور مجلس شوریٰ کے نائب صدر) بھی شامل تھے، اچھا ہوا اس بہانے ان تمام حضرات سے ملاقات ہو گئی۔

اسی روز عشاء کے بعد ہم لوگ مقبول عبدالکافی کے ہاں جرول گئے۔ وہاں بہت سے نوجوان جمع تھے، جن میں بعض مکہ ہی کے رہنے والے تھے اور بعض خاص طور پر جدہ سے آئے

تھے۔ استاذ احمد علی مدیر کلیۃ الشریعہ) اور شیخ عبدالرزاق حمزہ (خطیب حرم کی جو ان دنوں علاج کے سلسلے میں مصر گئے ہوئے تھے) کے صاحبزادے بھی موجود تھے۔ یہ تمام نوجوان مولانا کی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے مولانا سے مختلف موضوعوں پر سوالات کرنا شروع کیے۔ ان کے سوالات اسی قسم کے تھے جس قسم کے اس سے پہلے ریاض اور ظہران کے نوجوان پیش کر چکے تھے۔ عرب قومیت کے خلاف ان کے جذبات خاص طور پر سخت تھے۔ مولانا نے ان کے تمام سوالات کا اطمینان کے ساتھ جواب دیا، جس کا ان سب پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔

شیخ عبدالمالک بن ابراہیم اگلے روز ۴ دسمبر، ہم شیخ عبدالمہیمن کے ساتھ شیخ عبدالمالک بن ابراہیم کی ملاقات کے لیے گئے۔ یہ مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں جب ہم ریاض گئے تھے تو یہ شاہی مسجد کے خطیب تھے۔ اب حجاز میں ہیئۃ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے صدر ہیں۔ ان سے کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی۔ ریاض میں علماء و امراء کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ چلتے وقت انہوں نے کتابوں کی ایک اچھی مقدار ہمیں بطور ہدیہ پیش فرمائی۔

شیخ عبدالوہاب دہلوی واپسی میں ہم شیخ عبدالوہاب دہلوی اور ان کے چچا شیخ اسماعیل کے ہاں حاضر ہوئے۔ ان کا خاندان دہلی والوں کا مشہور خاندان ہے جو گزشتہ ساٹھ سال سے مکہ ہی میں آباد ہے، لیکن اپنے لباس، زبان، طرز رہائش ہر چیز میں ابھی تک سخت دہلوی ہے۔ شیخ عبدالوہاب صاحب، بڑے عالم اور محقق آدمی ہیں، ان کا کتب خانہ بھی بہت وسیع ہے، اگرچہ لکھتے بہت کم ہیں۔ کبھی کبھار ہی ان کے مضامین الحج اور بعض دوسرے پرچوں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ان کی صحت خراب چلی آرہی ہے۔ دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ وہ مولانا سے تفہیم القرآن کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ دورانِ گفتگو مولانا ابوالکلام مرحوم کے متعلق انہوں نے ایک عجیب بات بتائی کہ جب

ان کی تفسیر سورۂ فاتحہ شائع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس میں آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر سرے سے نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں کلکتہ گیا اور وہاں ان سے ملا، تو میں نے تفسیر میں اس کمی کی طرف انہیں توجہ دلائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا تھا، اس لیے میں نے اس آیت کی تفسیر چھوڑ دی۔

اس روز جمعہ تھا۔ حرم میں جمعہ پڑھنے کے بعد ہم لوگ طائف کے لیے روانہ ہو گئے۔

مکہ سے طائف: مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان غالباً کوئی باقاعدہ بس سروس نہیں ہے۔ صرف چھوٹی گاڑیاں (ٹیکسیاں) آتی جاتی ہیں۔ فاصلہ ۱۲۰ کیلومیٹر (۷۵ میل کے قریب) ہے لیکن ٹیکسیوں والے راستے کے خراب ہونے کی وجہ سے کرایہ بہت وصول کرتے ہیں۔ ٹیکسی والے نے ہم سے ۷۵ ریال (۲۰۰ روپے) وصول کیے۔

ہم نے مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد ہی جمعہ کے روز طائف جانا طے کر لیا تھا۔ اتفاق سے ایک روز حرم میں ہمارے ایک پاکستانی بھائی فیض عالم صاحب سے ملاقات ہو گئی، جو چند سال سے طائف ہی میں مقیم ہیں۔ اور اسی روز مکہ سے طائف واپس جا رہے تھے۔ ان کے ذریعے ہم کو طائف میں قیام اور مشاہدۂ مقامات کا انتظام کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی، ورنہ ہمارے لیے طائف بالکل اجنبی مقام تھا اور وہاں ہم کسی کو نہ جانتے تھے۔

جس راستے سے ہم گئے وہ مکہ اور منیٰ کی سڑک پر کچھ دور چل کر بائیں ہاتھ مڑ جاتا ہے۔ پھر جبلِ نور کے دامن سے گزرتے ہوتے آگے بڑھ کر ہم جعرانہ کی طرف مڑ گئے۔ یہ جعرانہ وہی جگہ ہے جہاں غزوۂ حنین و طائف کے بعد طائف سے واپسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن و ثقیف کا مالِ غنیمت صحابۂ کرام میں تقسیم فرمایا تھا۔ یہ راستہ اگرچہ بہت چلتا ہوا اور باقاعدہ بنا ہوا ہے، لیکن بالکل کچا ہے۔ کہیں سخت ریت آتی ہے اور کہیں پتھریلی زمین۔ دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد یہ راستہ بھی دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ بائیں طرف کا راستہ جعرانہ کو جاتا ہے اور دائیں طرف کا شرائع کو۔ ہم شرائع کے راستہ پر چلتے رہے اور کوئی پندرہ بیس

منٹ اور چلنے کے بعد شرائع پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے اور ایک چشمہ کی وجہ سے آباد ہے۔ جعرانہ یہاں سے ٹھیک شمال کو واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ جعرانہ اور شرائع کے درمیان وہ وادی ہے جہاں جاہلیت کے زمانے کے تین مشہور بازاروں (عکاظ، مجنّہ اور ذی المجاز) میں سے مجنّہ کا بازار لگا کرتا تھا۔

شرائع سے تقریباً نصف گھنٹہ چلنے کے بعد ہم زَیمہ پہنچے، جو ایک نہایت ہی سرسبز و شاداب جگہ ہے اور یہاں بہت سے باغات اور چشمے پائے جاتے ہیں۔ دوسرے درختوں کے علاوہ ہمیں وہاں کیلے کے درخت بھی نظر آتے۔ یہاں اتر کر ہم نے عصر کی نماز پڑھی اور پھر آگے روانہ ہوئے۔ زَیمہ کے بعد جو راستہ شروع ہوا، وہ بہت ہی تکلیف دہ (عربوں کی عامی زبان میں اَبطال) تھا۔ اس پر پتھر کے ٹکڑے اس طرح بکھرے ہوئے تھے جس طرح کسی جگہ نئی سڑک بنانے کے لیے پتھر کے ٹکڑے ڈال دیئے جاتے ہیں اور بعض جگہ ان کے اس طرح ڈھیر بنے ہوئے تھے کہ موٹر کے لیے ان میں سے راستہ نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ پتھر کے ان ٹکڑوں کو بارش کے زمانہ میں پہاڑی نالے بہا لاتے ہیں۔ حکومت آئے دن ان سے راستہ کو صاف کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ مگر بارش کا پانی ہمیشہ ان کوششوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اس راستہ میں ہماری موٹر کا ٹائر پھٹ گیا اور اس کی وجہ سے ہمارا بہت سا وقت ضائع ہوا۔ تقریباً پندرہ سولہ میل تک راستے کا یہی حال رہا۔ اس کے بعد قدرے اچھا راستہ آ گیا لیکن پہاڑوں کے درمیان گھر گیا اور نمایاں طور پر چڑھائی محسوس ہونے لگی۔ ڈرائیور کافی زور لگا کر موٹر چلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوا اور ہم السیل الکبیر پہنچ گئے۔

السیل الکبیر ایک کھلی وادی میں واقع ہے، اور اس میں جا بجا چائے کی بہت سی دکانیں ہیں، جو حج کے دنوں میں تو بہت آباد رہتی ہیں، لیکن اس وقت بھی ہمیں ان پر اچھی خاصی رونق نظر آئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہی السیل الکبیر وہ قرن المنازل ہے جس کو حدیث میں اہلِ نجد کے لیے میقات قرار دیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قرن المنازل اس کے دائیں طرف

(یعنی جنوب میں) ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اور یہ اس کے قریب اور اس کی سیدھ میں واقع ہے اس لیے طائف اور نجد کی طرف سے آنے والے تمام حاجی یہیں سے احرام باندھتے ہیں، اس لیے یہاں بہت سے غسل خانے پاٹے جاتے ہیں، جن میں پیسے دے کر غسل کیا جا سکتا ہے۔ ایک شاندار نئی مسجد بھی یہاں بنی ہوئی ہے۔ ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں پڑھی۔ ایک نجدی امام صاحب نے جماعت کرائی اور اتنی تیز نماز پڑھائی کہ ہمارے لیے ان کی متابعت مشکل ہو رہی تھی۔

السیل الکبیر کے بعد تھوڑی دور تک راستہ پہاڑ کو کاٹ کر بنایا گیا ہے، جس پہاڑ کو کاٹ کر یہ راستہ بنایا گیا ہے، مشہور مصری صحافی محمد حسین ہیکل نے اس کا نام ذات عرق لکھا ہے۔ ذات عرق کا ذکر حدیث میں اہل عراق کے لیے میقات کے طور پر آتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ذات عرق یہاں سے شمال کی طرف نجد میں عُشیرہ کے قریب کسی جگہ کا نام ہے۔ یہ پہاڑ تو بہر حال اسی زمانہ میں کاٹا گیا ہے۔ پہلے زمانہ میں جو لوگ اس راستے سے سفر کرتے تھے، وہ اس پہاڑ کے گرد چکر لگا کر آتے ہوں گے۔ غزوہ حُنین کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام طائف کا محاصرہ کرنے کے لیے اسی راستہ سے تشریف لائے تھے، انہیں بھی یقیناً اس پورے پہاڑ کے گرد چکر لگانا پڑا ہو گا۔

اندھیرے میں اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہو سکا، لیکن کہتے ہیں کہ اس پہاڑ کے بعد راستہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دائیں طرف کا راستہ طائف کو جاتا ہے (اور ہم اسی پر چلتے رہے ہوں گے) اور بائیں طرف کا راستہ عُشیرہ سے ہوتا ہوا ریاض کو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک اور جگہ آئی، جسے السّیل الصغیر کہا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں ٹھہرے بغیر اپنا سفر جاری رکھا۔ راستہ کا وہی حال تھا۔ کہیں سخت پتھر آجاتے، جن میں موٹر بہت ہی آہستہ رفتار سے چلتی اور کہیں قدرے ہموار راستہ آجاتا جس میں موٹر خوب تیز چلتی۔ یہاں بھی ایک جگہ ہماری موٹر کا ٹائر پھٹ گیا۔ ڈرائیور نے اندھیرے میں بڑی مشکل سے اس کی

جگہ دوسرا ٹائر لگایا اور ہم آگے روانہ ہو سکے۔ شکر ہے ڈرائیور نے عقلمندی کی اور اسپیل الجبیر میں ٹائر کی مرمت کر دی تھی، ورنہ معلوم نہیں ہم پر کیا گزرتی ؟ جب ہم طائف سے صرف ۲۷ کیلو میٹر (۱۹ میل کے قریب) رہ گئے تو حوایا کا مقام آیا جہاں طائف کا ہوائی اڈہ ہے۔ اور یہاں سے طائف تک نہایت عمدہ پختہ سڑک جاتی ہے۔ اس سڑک پر پہنچ جانے کے بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

طائف رات کے دس بجے کے قریب ہم طائف پہنچے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں فیض عالم صاحب اور دوسرے احباب نے مایوس ہو کر ہمارا انتظار نہ چھوڑ دیا ہو، کیونکہ اصل میں تو ہم نے انہیں مغرب کے بعد پہنچ جانے کا وقت دیا تھا، لیکن الحمد للہ جونہی ہم شہر میں داخل ہوئے فیض عالم صاحب اور ان کے ساتھ توختہ اخوند ایک موڑ پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ توختہ اخوند ایک ترکستانی مہاجر ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے مولانا مودودی کے پاس کئی سال تک رہ چکے ہیں، پھر یہ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ اب کئی سال سے طائف میں مقیم ہیں۔ ہمیں طائف میں ان کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ لیکن ایک چودہ برس کے بعد ان کی مولانا سے یہ پہلی ملاقات تھی، اس لیے بہت ہی محبت اور عقیدت کے عالم میں بغلگیر ہوئے۔

ترک مہاجرین ہمارے قیام کا انتظام ان لوگوں نے محلۂ بخاریین میں کیا تھا، جس کی زیادہ تر آبادی روسی ترکستان کے مہاجرین ہی پر مشتمل ہے اور اسی لیے اسے محلہ بخاریین کہا بھی جاتا ہے۔ ہم جس گھر میں ٹھہرے تھے۔ اس کے ساتھ محلہ کی مسجد بھی اور اس کے امام و خطیب بھی ایک ترکستانی عالم قاری عبد السلام صاحب تھے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی بہت سے ترکستانی حضرات تشریف لے آئے، اور کافی دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ وہ تھے جو روسی انقلاب کے بعد اپنے وطن سے ہجرت کر کے پہلے ہندوستان آئے تھے اور وہاں کافی عرصہ رہ کر عرب منتقل ہو گئے تھے۔ اس لیے اردو نہ صرف یہ کہ اچھی خاصی جانتے تھے بلکہ ہم سے اردو ہی میں بات چیت کرتے رہے۔ ہمارے

تو ختہ اخوند کی زبان خوب تھی۔ گویا ترکی، فارسی، اردو اور عربی کا مرکب اور مرکب بھی نہایت دلچسپ، مثلاً اگر انہیں یہ کہنا ہوتا کہ پانی نہیں آیا، تو وہ کہتے تھے "آب ما آیا" اسی طرح کے اور بھی بہت سے دلچسپ فقرے وہ بولا کرتے تھے، جنہیں میں بھول گیا۔ طائف میں ان ترکستانی مہاجرین کے سوا کسی اور سے ہماری واقفیت نہ تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی واقفیت کی ضرورت بھی نہ تھی۔ جس محبت، اخلاص اور عقیدت سے ان حضرات نے ہمارا استقبال کیا اور دو دن تک ہماری مہمانی کی، اس کا کسی دوسرے میزبان میں پایا جانا مشکل تھا۔ محبت، سنجیدگی اور خلوص کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں طور پر ظاہر ہو رہے تھے۔ ان کے متعلق ہمیں یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور قدرے خوشی بھی کہ ان لوگوں نے عرب میں بھی اتنا عرصہ رہ کر اپنا لباس تبدیل نہیں کیا نہ صرف عرب بلکہ جہاں بھی یہ لوگ رہتے ہیں ہمیشہ اپنا قومی لباس ہی پہنتے ہیں۔ ہم وہیوں کی طرح جگہ جگہ لباس تبدیل نہیں کرتے پھرتے۔ یہ اس بات کی نمایاں دلیل ہے کہ ان حضرات کے اندر مضبوط قومی کیرکٹر پایا جاتا ہے۔ ان کے دلوں میں اپنے وطن کو آزاد کرانے اور اس میں پھر سے اسلام کا بول بالا کرنے کا جذبہ پوری طرح موجزن ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزائم میں برکت دے اور دنیا کو ان کا مسئلہ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

طائف کا موسم | طائف میں اگرچہ مکہ معظمہ کی نسبت کافی سردی تھی، لیکن اتنی سردی نہیں تھی جس کا تصور ہم اپنے ذہن میں لیے ہوئے تھے۔ لوگ بھی ہمیں طائف کی سردی سے خوب ڈرا رہے تھے۔ حالانکہ وہاں دسمبر میں بس اتنی سردی تھی، جتنی ہمارے یہاں لاہور میں نومبر کے آخر میں ہوتی ہے۔ (باقی)

رسائل و مسائل

پردہ اور اپنی پسند کی شادی

سوال ۱۔ اسلامی پردے کی رُو سے جہاں ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں دو ایسے نقصانات ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا، بجز اس کے کہ صبر و شکر کر کے بیٹھ جائیں۔

اوّل یہ کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی جس کا ایک خاص ذوق ہے اور جو اپنے دوست منتخب کرنے میں ان سے ایک خاص اخلاق اور ذوق کی توقع رکھتا ہے، فطرتاً اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ شادی کے لیے ساتھی بھی اپنی مرضی سے منتخب کرے، لیکن اسلامی پردے کے ہوتے ہوئے کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا ساتھی چنے بلکہ اس کے لیے وہ قطعاً دوسروں یعنی ماں یا خالہ وغیرہ کے دست نگر رہتے ہیں، ہماری قوم کی تعلیمی حالت ایسی ہے کہ والدین عموماً اَن پڑھ اور اولاد تعلیم یافتہ ہوتی ہے اس لیے والدین سے یہ توقع رکھنا کہ موزوں رشتہ ڈھونڈھ لیں گے ایک عبث توقع ہے۔ اس صورت حال سے ایک ایسا شخص جو اپنے مسائل خود حل کرنے اور خود سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک لڑکی جو گھر سے باہر نہ نکلنے کی پابند ہو وہ کیونکر ایسی وسعتِ نظر، فراست اور عقلِ عام کی مالک ہو سکتی ہے کہ بچوں کی بہترین تربیت کر سکے اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح سے بیدار کر دے، اس کو

تو دنیا کے معاملات کا صحیح علم ہی نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہی تعلیم بھی حاصل کرے جتنی ایک بے پردہ لڑکی نے حاصل کی ہوتی ہے تو بھی اس کی ذہنی سطح کم ہو گی کیونکہ اسے اپنے علم کو عملی طور پر پرکھنے کا کوئی موقع ہی حاصل نہیں ــــ امید ہے آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے۔

جواب - آپ نے اسلامی پردے کی جن خرابیوں کا ذکر کیا ہے اوّلاً تو وہ ایسی خرابیاں نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر آدمی لاینحل مشکلات میں مبتلا ہو جائے اور ثانیاً حیاتِ دنیوی میں آخر کونسی ایسی چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن کسی چیز کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ اُس کے صرف ایک یا دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر اُس میں مصالح کو غلبہ حاصل ہے یا مفاسد کو۔ یہی اصول پردے کے بارے میں اختیار کیا جائے گا۔ اسلامی پردہ آپ کی رائے میں بھی بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ لیکن فقط یہ مشکل کہ اس کی پابندی سے آدمی کو شادی کے لیے اپنی مرضی کے مطابق لڑکی منتخب کرنے کی آزادی نہیں مل سکتی پردے کی احادیث کو کم یا اُس کی پابندی کو ترک کرنے کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ بلکہ اگر ہر لڑکے کو لڑکی کے انتخاب اور ہر لڑکی کو لڑکے کے انتخاب کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو اس سے اس قدر خلیج نتائج برآمد ہوں گے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر خاندانی نظام جو کہ معاشرے کی مضبوطی اور پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور ایک موہوم مشکل کو حل کرتے کرتے بے شمار حقیقی مشکلات کے دروازے کھل جائیں گے۔

آپ کا یہ خیال کہ باپردہ لڑکی وسعتِ نظر اور فراست سے بے بہرہ ہوتی ہے درست نہیں ہے اور اگر اسے بالفرض درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں پردے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ایک لڑکی باپردہ رہ کر بھی علم و فن میں کمال پیدا کر سکتی ہے اور اس کے مقابلے میں پردے سے باہر ہو کر بھی ایک لڑکی علم و عقل اور فراست و بصیرت سے کوری رہ سکتی ہے

البتہ بے پردہ لڑکی کو یہ فوقیت ضرور ہو گی کہ وہ معلومات کے لحاظ سے چاہے وسیع النظر نہ ہو لیکن تعلقات کے لحاظ سے اُس کی نگاہیں ضرور پھیل جائیں گی۔ ایسی حالت میں اگر موزوں ترین رفیقِ حیات کی تلاش میں کامیابی ہو بھی جائے، تب بھی جو نگاہیں وسعت کی عادی ہو چکی ہوں انہیں سمیٹ کر ایک مرکز تک محدود رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہو گا۔

سوال ۷:۔ آپ کا جواب ملا۔ مگر مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ آپ نے اسے بالکل معمولی مسئلہ قرار دیا۔ کامیاب شادی کی تمنا تو ایک جائز خواہش ہے اور ایسے حالات پیدا کرنا جن کی وجہ سے ایک شخص کے لیے اپنی پسند کی لڑکی چننے کا راستہ بند ہو جائے میں انسانی مسرت اور شخصیت کے ارتقاء کے لیے مضر سمجھتا ہوں اور دینِ فطرت کے منافی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ہمارے مروجہ طریقے کے مطابق عورت زیادہ سے زیادہ گھر کی منتظم ہوتی ہے اور خاوند اور اپنی جنسی تسکین کا ایک ذریعہ، لیکن وہ افراد کے اپنے آپ کو پوری طرح ایک دوسرے کے حوالے کرنے اور زندگی کے فرائض ایک بار کی بجائے خوشی خوشی پورا کرنے کے جو امکانات اپنی پسند اور ذوق کی شادی کر لینے میں ہوتے ہیں وہ اس صورت میں قطعاً ممکن نہیں کہ اپنی پسند اور بصیرت استعمال کیے بغیر کسی دوسرے کے انتخاب پر شادی کر لی جائے۔

میرا خیال ہے کہ ایک نوجوان محض جنسی تسکین کا خواہشمند نہیں ہوتا، وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی کے لیے کچھ قربانی کرے، کسی سے محبت کرے، کسی کی خوشی کا خیال رکھے اور کوئی اس کی خوشی پر خوش ہو۔ اس جذبے کے فطری نکاس کا راستہ تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے جسے اس نے تعلیم، اطوار، کردار اور دوسری خوبیوں کی بنا پر اپنی طبیعت کے مطابق حاصل کیا ہے۔ درحقیقی محبت کسی کی باطنی خوبیوں کے دیکھنے سے ہی پیدا ہوتی ہے نہ کہ شکل دیکھ لینے

سے ، اور یہ بات ناممکنات میں ہے کہ پہلے تو کسی کی شادی کرا دی جائے اور پھر اس سے مطالبہ کیا جاتے کہ اب اسے ہی چاہو اور یوں جیسے تم نے اس کو خود پسند کیا ہے۔ اس فطری محبت کا راستہ بند کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ اپنے لیے دوسرے راستے نکال لیتا ہے۔

پردے کی وجہ سے جو حالات پیدا ہیں ان میں حقیقتاً کرداد دیکھ کر تلاش کرنا ممکن نہیں۔ لڑکے کے باپ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ لڑکی کا پتہ چلا سکے ، لڑکی کی والدہ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لڑکے کے متعلق براہِ راست کچھ اندازہ لگا سکے کیونکہ پردے کی وجہ سے ان افراد میں بھی تعلق اور آزادانہ گفتگو ناممکن ہے (خود لڑکے اور لڑکی کا ملنا تو ایک طرف رہا) بڑی سے بڑی آزادی جو اسلام نے دی ہے وہ یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کی شکل دیکھ لے ، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کسی کی شکل چند سیکنڈ دیکھ لینے سے کیا ہو جاتا ہے

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے ، اب تو تمام علماء نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ موجودہ تمدنی ضروریات پورا کرنے کے لیے علم کا حاصل کرنا عورتوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی کام کر سکتی ہیں یا تو اسلامی احکام کی پابندی کریں یا علم حاصل کریں۔ پردے کی پابند ہوتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ طبقات الارض ، آثارِ قدیمہ انجینئرنگ اور تمام ایسے علوم جن میں سردے اور دور دراز کے سفر کی ضرورت ہوتی ہے ان علوم کے لیے خواتین کس طرح کام کر سکتی ہیں جبکہ محرم کے بغیر عورت کا تین دن سے زائد کی مسافت پر نکلنا بھی منع ہے ، اب کیا ہر جگہ وہ اپنے ساتھ محرم کو لیے لیے پھرے گی ؟

یہ علوم تو ایک طرف رہے ، میں تو ڈاکٹری اور پردے کو بھی ایک دوسرے کی ضد سمجھتا ہوں ، اوّل تو ڈاکٹری کی تعلیم ہی جو جسمانیات کی نگاہیں پھیلا دینے والے

معلومات سے پُر ہوتی ہے، جیلکہ اس احساس کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے جس کی مشرقی عورتوں سے توقع کی جاتی ہے، خواہ وہ ڈاکٹری پردے ہی میں سکھی جائے اور پڑھانے والی تمام خواتین ہی کیوں نہ ہوں۔ دوم ڈاکٹر بننے پر ایک خاتون کو مریضوں کے لواحقین سے روابط کی اس قدر ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے غیر مردوں سے بات چیت پر قدغن لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس کے پیش نظر اگر ہم خواتین کو ڈاکٹر بننے سے روکتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے گھروں کی مریض خواتین کے ہر مرض کے علاج کے لیے مرد ڈاکٹروں کی خدمات کی ضرورت پڑے گی اور رائج الوقت نظریۂ حیا کے مطابق یہ تو اس سے بھی زیادہ معیوب سمجھا جائے گا۔

جناب عالی آپ مجھے یہ بتائیں کہ ان معاشرتی اور تمدنی الجھنوں کا اسلامی احکامات کی پابندی کرتے ہوئے کیا حل ہے؟

جواب - آپ کا دوسرا خط ملا۔ شادی کے معاملے میں آپ نے جو الجھن بیان کی ہے وہ اپنی جگہ درست ہی سہی، لیکن اس کا حل کورٹ شپ کے سوا اور کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جس تفصیل کے ساتھ رفیقِ زندگی بنانے سے پہلے لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے کے اوصاف، مزاج، عادات، خصائل اور ذوق و ذہن سے واقف ہونے کی ضرورت آپ محسوس کرتے ہیں، ایسی تفصیلی واقفیت دو چار ملاقاتوں میں، اور وہ بھی رشتہ داروں کی موجودگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے مہینوں ایک دوسرے کے ساتھ ملنا، تنہائی میں بات چیت کرنا، سیر، تفریح، سفر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اور بے تکلف دوستی کی حد تک تعلقات پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ کیا واقعی آپ یہی چاہتے ہیں کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اس اختلاط کے مواقع بہم پہنچنے چاہئیں؟ آپ کے خیال میں ان جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اندر ان معصوم فلسفیوں کا فی صدی تناسب کیا ہوگا جو بڑی سنجیدگی کے ساتھ صرف رفیقِ زندگی کی تلاش میں یہ مخلصانہ تحقیقاتی روابط قائم کریں گے

اور اس دوران میں شادی ہونے تک اس طبعی جذب و انجذاب کو قابو میں رکھیں گے جو خصوصیت کے ساتھ نوجوانی کی حالت میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے اپنے اندر رکھتے ہیں؟ بحث برائے بحث اگر آپ نہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ شاید دو تین فی صدی سے زیادہ ایسے لوگوں کا اوسط ہماری آبادی میں نہ نکلے گا۔ باقی اس امتحانی دور ہی میں فطرت کے تقاضے پورے کر چکے ہوں گے۔ اور وہ دو تین فیصدی بھی جو اس سے بچ نکلیں گے، وہ بھی اس شبہ سے نہ بچ سکیں گے کہ شاید وہ باہم ملوّث ہو چکے ہوں۔

پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لڑکا اور لڑکی جو اس تلاش و تحقیق کے لیے باہم خلا ملا کریں گے وہ لازماً ایک دوسرے کو رفاقت کے لیے منتخب ہی کریں گے؟ ہو سکتا ہے کہ ۲۰ فیصدی دوستیوں کا نتیجہ نکاح کی صورت میں برآمد ہو۔ ۸۰ فی صدی یا کم از کم ۵۰ فیصدی کو دوسرے یا تیسرے تجربے کی ضرورت لاحق ہو گی۔ اس صورت میں ان "تعلقات" کی کیا پوزیشن ہو گی جو دورانِ تجربہ میں آئندہ نکاح کی امید پر پیدا ہو گئے تھے۔ اور ان شبہات کے کیا اثرات ہونگے جو "تعلقات" نہ ہونے کے باوجود ان کے متعلق معاشرے میں پیدا ہو جائیں گے؟

پھر آپ یہ بھی مانیں گے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ان مواقع کے دروازے کھول دینے کے بعد انتخاب کا میدان لامحالہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ ایک ایک لڑکے کے لیے صرف ایک ہی ایک لڑکی مطمح نظر نہ ہو گی جس پر اپنی نگاہِ انتخاب مرکوز کر کے تحقیق و امتحان کے مراحل طے کرے گا اور علیٰ ہذا القیاس لڑکیوں میں سے بھی ہر ایک کے لیے ایک ہی ایک لڑکا امکانی شوہر کی حیثیت سے زیرِ امتحان نہ ہو گا۔ بلکہ شادی کی منڈی میں ہر طرف ایک سے ایک جاذبِ نظر مال موجود ہو گا جو امتحانی مراحل سے گزرتے ہوئے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے سامنے بہتر انتخاب کے امکانات پیش کرتا رہے گا۔ اس وجہ سے اس

امر کے امکانات روز بروز کم ہوتے جائیں گے کہ ابتداءً جو دو فرد ایک دوسرے سے آزمائشی ملاقاتیں شروع کریں وہ آخر وقت تک اپنی اس آزمائش کو نباہیں اور بالآخر ان کی آزمائش شادی پر منتج ہو۔

اس کے علاوہ یہ ایک فطری امر ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ جو رومانی طرز کا کورٹ شپ کرتے ہیں ان میں دونوں ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے روشن پہلو ہی دکھاتے ہیں۔ مہینوں کی ملاقاتوں اور گہری دوستی کے باوجود ان کے کمزور پہلو ایک دوسرے کے سامنے پوری طرح نہیں آتے۔ اس دوران میں شہوانی کشش اتنی بڑھ چکی ہوتی ہے کہ وہ جلدی سے شادی کر لینا چاہتے ہیں، اور اس غرض کے لیے دونوں ایک دوسرے سے ایسے ایسے پیمانِ وفا باندھتے ہیں، اتنی محبت اور گرویدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ شادی کے بعد معاملات کی زندگی میں وہ عاشق و معشوق کے اس پارٹ کو زیادہ دیر تک کسی طرح نہیں نباہ سکتے، یہاں تک کہ جلدی ہی ایک دوسرے سے مایوس ہو کر طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ کیونکہ دونوں ان توقعات کو پورا نہیں کر سکتے جو عشق و محبت کے دور میں انہوں نے باہم قائم کی تھیں، اور دونوں کے سامنے ایک دوسرے کے وہ کمزور پہلو آجاتے ہیں جو معاملات کی زندگی ہی میں ظاہر ہوا کرتے ہیں، عشق و محبت کے دور میں کبھی نہیں کھلتے۔

اب آپ ان پہلوؤں پر بھی غور کر کے دیکھ لیں۔ پھر آپ مسلمانوں کے موجودہ طریقے کی مزعومہ قباحتوں اور اس کورٹ شپ کے طریقے کی قباحتوں کے درمیان موازنہ کر کے خود فیصلہ کریں کہ آپ کو ان دونوں میں سے کونسی قباحتیں زیادہ قابلِ قبول نظر آتی ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی آپ کورٹ شپ ہی کو زیادہ قابلِ قبول سمجھتے ہیں تو مجھ سے بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خود یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس اسلام کے ساتھ آپ اپنا تعلق رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں جو اس راستے پر چلنے کی اجازت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے۔ یہ کام آپ کو کرنا ہو تو کوئی دوسرا معاشرہ تلاش کریں۔ اسلام سے

سرسری واقفیت بھی آپ کو یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اس دین کے حدود میں "کامیاب شادی" کا وہ نسخہ استعمال کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جسے آپ مباح کرنا چاہتے ہیں۔

عورتوں کی تعلیم کے متعلق آپ نے جن مشکلات کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ فطرت نے عورت اور مرد کے دائرۂ کار الگ رکھے ہیں۔ اپنے دائرۂ کار کے فرائض انجام دینے کے لیے عورت کو جس بہتر سے بہتر تعلیم کی ضرورت ہے وہ اسے ضرور ملنی چاہیے اور اسلامی حدود میں وہ پوری طرح دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے ایسی علمی و ذہنی ترقی بھی ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے جو عورت کو اپنے دائرۂ کار کے فرائض انجام دیتے ہوئے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس معاملہ میں کوئی انتظامات کرنا مسلمانوں کی کوتاہی ہے نہ کہ اسلام کی۔ لیکن وہ تعلیم جو مرد کے دائرۂ کار کے لیے عورت کو تیار کرے، عورت ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے تباہ کن ہے اور اس کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے آپ میری کتاب "پردہ" کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

مطبوعات

ابن ماجہ اور علم حدیث | تالیف: مولانا محمد عبدالرشید نعمانی۔ طابع و ناشر: نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب آرام باغ، کراچی۔ صفحات ۲۵۹۔ بڑی تقطیع قیمت ۸ روپیہ۔

یوں تو یہ کتاب ابن ماجہؒ کی سوانح عمری ہے لیکن اس میں مولانا محمد عبدالرشید نعمانی صاحب نے نہایت ہی مستند حوالوں کے ساتھ اُس مواد کو جمع کر دیا ہے جو تدوینِ حدیث کے سلسلے میں فراہم ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اس امت کے ائمہ اور علماء نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کرنے میں کس نوعیت کی کاوشیں کیں۔ انہوں نے کس فہم اور تدبّر کا ثبوت دیا اور ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جو ریکارڈ حدیث کی شکل میں ہمارے پاس آج موجود ہے اُسے احتیاط کی کن کن چھلنیوں میں سے چھان کر قبول کیا گیا۔ اس ضمن میں ائمۂ فن جنہوں نے جرح و تعدیل کے نہایت نازک فرض کو ادا کیا اُن کے حالات بھی اس میں قلمبند فرما دیئے ہیں۔ مولانا نے یہ کتاب اگرچہ ایک مثبت نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر تصنیف کی ہے اور اس میں کسی مخالف سے تعرض کرنا ان کا مقصود نہیں لیکن مختلف مقامات پر جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی منکرینِ حدیث کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا بڑی دیدہ وری سے پردہ چاک کیا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے احادیث کی تعداد کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب محدثین احادیث کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد متونِ احادیث نہیں بلکہ طرق و اسانید ہیں۔" صلا۴

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"آج کل کے منکرین حدیث نے ابلہ فریبی کے لیے یہ شور مچا رکھا ہے کہ موجودہ حدیث کی کتابوں میں چند ہزار سے زائد احادیث کی تعداد پائی نہیں جاتی اور محدثین یہ کہتے ہیں کہ ہم نے لاکھوں حدیثوں سے ان کا انتخاب کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ احادیث کی بڑی تعداد خود محدثین کے بیانات کے مطابق خود ساختہ ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان چند ہزار کا بھی کیا اعتبار رہ جاتا ہے کہ جن کو لاکھوں موضوعات سے چھانٹ کر صحیح قرار دیا گیا ہو۔ اس لیے آپ خوب سمجھ لیجیے کہ یہ ایک بہت ہی بڑا سنگین مغالطہ ہے جو بے چارے ناواقف عوام کو دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ محدثین کے یہاں تو احادیث کی تعداد کا حساب ان کی اسانید کے اعتبار سے ہوتا تھا نہ کہ متون کے لحاظ سے پس اگر کسی حدیث کی مثلاً سو اسنادیں ہیں تو اس کی تعداد اپنی اسانید کے اعتبار سے سو ہو گی۔ چنانچہ حدیث انما الاعمال بالنیات کا جب شمار لگائیں گے تو اسے اس کی سات سو اسناد کے اعتبار سے سات سو شمار کریں گے۔" (ص ۴۳)

پوری کتاب بڑے فاضلانہ مباحث پر مشتمل ہے اور فاضل مصنف کے تبحر علمی کی ہر لحاظ سے آئینہ دار۔ کتاب کے آخر میں تقریباً سو صفحات کا اشاریہ (انڈکس) ہے، جس میں رجال، اماکن، قبائل و جماعات اور کتب کے نام حروفِ تہجی کے مطابق درج کیے گئے ہیں۔ مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کا یہ علمی کارنامہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ اور کارخانہ نور محمد نے اسے طبع کروا کر دین کی خدمت سرانجام دی ہے۔

کتاب میں اغلاط الطبع طبیعت پر بار ہیں۔ امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں انہیں دور کرنے کا اہتمام کیا جائے گا۔

نعیم العطاء فی حدیث المجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم | مترجم: مولانا السید غلام معین الدین صاحب نعیمی۔ طابع و ناشر: ادارہ نعیمیہ رضویہ ہفت روزہ سواد اعظم، موچی گیٹ۔ لاہور۔ قیمت

چار روپے۔ صفحات ۴۱۶ - ہندوستان میں ترسیلِ زر کا پتہ۔ جناب صوفی صابر حسن فاروقی۔ مکان نمبر ۱۸۶۵/۷ گلی پتے والی محلہ سوئیوالان دہلی ۶

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک پر عربی میں جو ذخیرۂ کتب موجود ہے اس میں علامہ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ کی فاضلانہ تصنیف کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفےٰ ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب نسیم الصفاء اسی کا اردو ترجمہ ہے جسے مفتی غلام معین الدین صاحب نعیمی نے بڑی محنت اور کاوش سے کیا ہے۔ ترجمہ کافی حد تک شستہ اور رواں ہے۔ البتہ کہیں کہیں عربی محاورات کو جب اردو میں جوں کا توں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ ذوق پر کچھ گراں سے محسوس ہوتے۔

کتاب کی ترتیب، طباعت اور کتابت بہت زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ اتنی بڑی تصنیف کا مضامین کی فہرست کے بغیر شائع کرنا ایک قاری کو مشکل میں ڈالنا ہے۔ کتابت ناقص ہے اور طباعت اتنی خراب کہ بعض صفحات پڑھے تک نہیں جاتے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک شاید یہ نقائص اس وجہ سے رہ گئے ہیں کہ ارکینِ ادارہ کا مقصد اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہے اسی وجہ سے اتنی ضخیم کتاب کی قیمت چار روپے رکھی گئی ہے لیکن ہمارا یہ خیال ہے کہ یہ تصنیف اتنی بلند پایہ ہے کہ اگر اس کو بہتر معیار پر شائع کر کے اس کی قیمت میں کچھ اضافہ بھی کر دیا جائے تو وہ سیرت کے شیدائیوں پر بالکل بار نہ ہوگا اور وہ اسے بہنسی خوشی برداشت کریں گے۔

امام احمد بن حنبلؒ | تالیف مولانا نصر اللہ خاں عزیز۔ طابع و ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ لاہور۔ صفحات ۱۱۲۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

زیرِ تبصرہ کتاب ملک کے مشہور صاحبِ علم اور صحافی مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے امام احمد بن حنبلؒ کے حالاتِ زندگی قلمبند کیے ہیں۔ فاضل مصنف نے امام صاحبؒ سے اپنی محبت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"انہوں نے کتاب و سنت کی ٹھیٹ پیروی کا مسلک دنیا کے سامنے پیش کیا

اور انہوں نے حق کی حمایت میں سلاطین و امراء کو پر کاہ کے برابر وقعت نہ دی۔ مجھے شروع ہی سے احساس تھا کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے جو جنگ چار خلفائے عباس سے لڑی وہ محض مسئلہ خلقِ قرآن کی کلامی یا اعتقادی یا فقہی نوعیت کی لیے نہیں تھی بلکہ اس اصل الاصول کے لیے تھی جو دینِ حق کی بنیاد ہے کہ خدا کے دین کی تعبیر کرنے کا معیار کتاب و سنت ہے ... امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر جب مجھے ۱۹۵۴ء میں انہی کی طرح قید کی فراغتیں نصیب ہوئیں تو میں نے ان کی زندگی کا یہ خلاصہ مرتب کیا۔"

پوری کتاب بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ طباعت اور کتابت کا معیار البتہ ایسا نہیں جسے اطمینان بخش کہا جا سکے۔

(بقیہ اشارات)

جا سکتا ہے۔ اس کی حیثیت اب مارکسیم کے اُس دُکاندار کی سی رہ گئی ہے جو محض دولت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ خود ایک اطاعت شعار انسان کی طرح آگے بڑھ کر ہماری خواہشات کی تکمیل کر دے تو اس کی زندگی محفوظ ہے ورنہ مادی فلاح کا حصول اتنا بلند مقصد ہے کہ اسے اس مقصد کی قربانگاہ پر بے دریغ بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے۔ مسلمان اب اس کی پیروی اور اطاعت کے لیے زندہ نہیں بلکہ یہ اب ایک ناچیز بندہ کی حیثیت سے اپنے آقا کی چاکری کے لیے دنیا میں موجود ہے۔ آقا جتنی چاہے اس سے خدمت لے اور جب چاہے بغیر وجہ بیان کیے اسے اپنے ایوان سے نکال دے۔ پھر اسے یہ بھی اختیار حاصل نہیں کہ وہ آقا سے یہ پوچھے کہ حضور آپ نے مجھے کیوں نکال باہر پھینکا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اس ظلم پر بھی خاموش رہے اور جتنی خدمت اُس سے لی گئی ہے اُسے ہی اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہوئے اپنا وقت بڑے سکون کے ساتھ گزار دے۔

آپ خود ہی سوچیے کہ دنیا کا کوئی دین اس بیچارگی اور درماندگی کی سطح پر رہتے ہوئے انسانیت کی کوئی خدمت سرانجام دے سکتا ہے؟ جب تک ہم کسی نظامِ حیات کو اپنا آئیڈیل نہیں بناتے، اس کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے، اُس کے مطالبات کے مطابق اپنی زندگی کے ڈھانچوں پر بدلنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتے اس وقت تک وہ دنیا کی مجلسوں میں گرمئ گفتار کا ذریعہ تو بن سکتا ہے مگر عملی زندگی میں بالکل بیکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جو لوگوں کے افکار، نظریات اور جذبات و احساسات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کا عظیم پروگرام رکھتا ہے اُس نے سب سے پہلے اپنے ماننے والوں سے یکسوئی کا مطالبہ کیا ہے اور بڑے واشگاف الفاظ میں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (۲:۲۰۸)

اُے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔

قرآن پاک ہر اُس قدم کو جو اسلام سے ہٹ کر اٹھایا جائے شیطان کی پیروی سے تعبیر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اگر کسی کو رحمٰن کی اطاعت مطلوب ہے تو پھر اُسے صرف اسلام کا قلادہ ہی اپنی گردن میں پہننا چاہیے۔ جو شخص اسلام کے علاوہ بھی چند افکار و نظریات پر ایمان رکھتا ہے اور انہیں نوعِ بشری کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری سمجھتا ہے وہ اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

قرآنِ حکیم ایک دوسرے مقام پر اس انتخاب و اختیار (PICK AND CHOOSE) کی پالیسی کی نہ صرف مذمت کرتا ہے بلکہ اس کے خطرناک نتائج سے بھی پوری طرح روشناس کراتا ہے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ (البقرہ)

کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو۔ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، اُن کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں گے۔

اس آیت میں خداوند تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ احکامِ دین کے اندر یہ تفرقی کی پالیسی یعنی بعض حصوں کو مصلحتِ وقت یا خواہشِ نفس، یا مفادات کے مطابق پاکر انہیں قبول کر لینا اور ان حصوں کو ترک کرنا جو بظاہر وقتی مصلحتوں یا نفس کے مطالبات یا قومی مفادات کے خلاف نظر آتے ہیں، دین کی پیروی نہیں بلکہ اُس کا مذاق ہے۔ جس دین کے متعلق ہمارے احساسات یہ ہوں کہ ہم اس کے اندر حسبِ منشا ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں اور وہ صرف ہمارے مفادات کی تائید کرنے کے لیے دنیا میں نازل ہوا ہے، اُس کے متعلق ہمارے دلوں میں جذبۂ عقیدت کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ پھر ہماری محبت کا مرکز نہیں رہتا بلکہ ہمارے نفس کے مطالبات، ہمارے قومی اور وطنی تقاضے ہمارے اصل معبود قرار پاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ کہنا کہ انسان مذہب کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ مذہب انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے، مذہب کے ساتھ ایک صریح ظلم اور زیادتی ہے اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی ایک بڑی افسوسناک بلکہ عبرتناک مثال ہے۔

دنیا کا کونسا ایسا انسان ہے اور اس کرۂ ارضی کی کونسی ایسی قوم ہے جس کے فکر و عمل میں اسلامی تعلیمات کے کچھ اجزا شامل نہیں۔ خالص کفر تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس دنیا میں قائم نہیں رہ سکتا۔ کفر بھی اپنے قیام اور بقا کے لیے بعض ایسے اصولوں کا محتاج ہے جن کی نشاندہی اسلام نے بھی کی ہے۔ مثلاً صبر و ثبات، اور نظم و ضبط۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت عرب کے مسلم قبائل اور غیر مسلم قبائل میں بعض ایسی صفات موجود تھیں جن کی قرآن مجید نے توصیف کی ہے مثلاً مہمان نوازی، لیکن یہ قدرِ مشترک ان کے درمیان اسلام و کفر کے امتیازات مٹانے کا ذریعہ نہ بن سکی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ عرب کے غیر مسلم قبائل میں اگرچہ بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی تھیں جو خداوند تعالیٰ کو عزیز ہیں لیکن انہوں نے اسلام کو بطور مبدأ اور اساسِ حیات تسلیم نہیں کیا تھا اس لیے وہ ان خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود کافر ہی رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق

رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو مرتد قرار دیکر اُن کے خلاف تلوار اٹھائی جو سوائے زکوٰۃ ادا کرنے کے اسلام کے باقی احکام نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ لیکن ان کے اس ادھورے اسلام کو قبول نہ کیا گیا اور ان کے خلاف خلیفۂ اولؓ اس انداز سے صف آرا ہوئے جیسے کہ کفار کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جاتا ہے۔ یہ سب حقائق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اسلام میں کسی شخص، قوم یا پوری دنیا کو بھی ترمیم و تنسیخ کا اختیار حاصل نہیں۔

تنسیخ و ترمیم کا یہ عمل اس بات کی واضح علامت ہے کہ ہم اس دین کو ناقص سمجھتے ہیں اور جس نظامِ زندگی کے بارے میں خود اس کے علمبرداروں کی یہ رائے ہو وہ دوسروں کے لیے کس طرح باعثِ کشش ہو سکتا ہے۔ اسلام کے اندر رہکر بیوفتی کرنے والے لوگوں کو قرآن مجید نے بڑی صراحت سے اُن کا انجام بھی بتا دیا ہے یعنی انہیں اس دنیا میں بھی ناکامی اور رسوائی اور آخرت میں وہ دردناک عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ جو فرد اسلام کے اندر انتخاب و اختیار کی پالیسی کا قائل ہے وہ درحقیقت خدا کا بندہ نہیں بلکہ اپنی خواہشات کا غلام ہے اور ایسے لوگ یا گروہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کامیابی اصولوں کی پیروی کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اصولوں کو نفس کے مطالبہ کے تحت توڑنے اور موڑنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی نظام کا پابند نہیں اور دنیا کے ہر نظام میں اُس کی خواہش کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی ہے وہ دراصل قوموں کے عروج و زوال کے بنیادی فلسفہ سے ناواقف ہے۔ مسلمانوں کا تو ذکر ہی چھوڑیئے کیونکہ ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ وہ اسلام کو بطور ہدایتِ الٰہی تسلیم کرتا ہے اس لیے وہ اس میں کسی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس اختیار و انتخاب کے نظریہ کو ان لوگوں نے بھی باطل ٹھہرایا ہے جو کسی الہامی تعلیم کے قائل نہیں۔ انہوں نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ دنیا کا ہر نظام ایک کل ہوتا ہے اور اس کے چند اجزاء مستعار لے لینے سے اس نظام کے اچھے پہلوؤں کو اپنایا نہیں جا سکتا۔ ابھی حال ہی میں ایک مغربی فاضل نے اپنے ایک مضمون میں اس امر کی

صراحت کرتے ہوئے کہا:

"تہذیب ایک کل ہے۔ اس کے فنونِ لطیفہ، اس کے الٰہیات، اس کے معاشرتی اصول اس کے معاشی اور صنعتی کمالات میں ایک گہرا رابطہ ہے۔ مجھے اس امر میں شک ہے کہ کیا کوئی قوم اپنی مرضی کے مطابق کسی نظام میں انتخاب و اختیار کی پالیسی اختیار کر سکتی ہے": (لوئی ڈکسن)

تفہیم القرآن جلد سوم کے متعلق ضروری اعلان

ملک کے ہر حصہ سے تفہیم القرآن جلد سوم کے متعلق پیہم استفسار کیا جا رہا ہے کہ اس کی اشاعت کب ہو گی؟ اُن حضرات کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مولانا نے محترم نے اس کا مسودہ ہمیں دے دیا ہے اور اس کی کتابت ہو رہی ہے۔

ناظرین کو اس کے انتظار کی زحمت اس لیے اٹھانا پڑی کہ مولانا نے اس کی تیاری کے سلسلے میں پچھلے سال ارض القرآن کا ایک اہم سفر کیا اور اُن تمام علاقوں کا سروے کرتے ہوئے ضروری تاریخی مقامات کے فوٹو اور جغرافیائی نقشے حاصل کیے جن کا اس تفسیر سے تعلق ہے۔ جلد سوم میں یہ نقشے اور فوٹو شامل کیے جا رہے ہیں۔ جلد سوم تاریخ قرآن کی ایک اہم مصور دستاویز ہو گی۔ انشاء اللہ

ناظرین خاص اور خاصتہ بین مولانا محترم کے لیے دعا فرمایا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم کام میں ان کی مدد فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کی شایانِ شان اشاعت کر کے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں آمین۔ اس سلسلہ میں ہمیں اپنے کرم فرما اور خیر خواہ حضرات کے مفید مشوروں کی بھی ضرورت ہے۔

شیخ قمر الدین ناشر تفہیم القرآن

مکتبہ تعمیر انسانیت۔ موچی دروازہ۔ لاہور

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

"اسلامی نظریات اور اسلوب فکر پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو جو دسترس حاصل ہے اور حسن خوبی سے وہ ان مسائل کو بیان کر گزرتے ہیں وہ دور حاضر میں انہی کا حصہ ہے زیر نظر کتاب در حقیقت موصوف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۳۳-۱۹۳۲ء میں لکھے تھے لیکن کتاب کی شکل میں انکی اشاعت پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ہوئی اب خود مصنف کی نظرثانی کے بعد اسے شائع کیا گیا ہے ۔

اس کتاب کے بارے میں مختصر طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کے بنیادی عقاید اور اساسی نظریات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید اور ضروری ہے اسے پڑھنے کے بعد ایک عام شخص بھی یہ جان سکتا ہے کہ خدا، غیب، انبیاء الہی کتابوں، قیامت، موت کے بعد زندگی اور دوسرے بنیادی عقیدے کیوں ہیں ۔ کیسے ہونے چاہیں ۔ اور یہ دین کی اساس کیوں کر ہیں ؟ اسلام اور قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے اس کتاب میں ہر باشعور آدمی کے لئے اپیل ہے ۔ مفہوم بلند اور عالمانہ ہونے کے باوجود انداز تحریر سبک اور شگفتہ ہے ۔

پاکستان میں جس کی تشکیل و تعمیر ہی اسلامی عصبیت کی اساس پر ہے ایسی کتابوں کی اشاعت زیادہ سے زیادہ کرنی چاہئے جو دین سے بیگانگی کے رجحانات کا موثر سدباب کر سکیں اور عام خواندہ طبقے کو اسلام سے روشناس رکھ سکیں ۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء)

قیمت مجلد مع دیدہ زیب گردپوش روپے ۸/-

ملنے کا پتہ :-